اصحاب کہف
اور
یاجوج ماجوج
امام الہند ابوالکلام آزادؒ
طارق اکیڈمی فیصل آباد

اصحابِ کہف
اور
یاجوج ماجوج

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ
اَلْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا
مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ○

الکہف : ۹

کیا تم خیال کرتے ہو کہ غار اور لوح والے ہماری
نشانیوں سے عجیب (نشانی) تھے؟

اصحابِ کہف

اور

یاجوج ماجوج

مولانا ابوالکلام آزادؒ

طارق اکیڈمی
ڈی گراؤنڈ (سوسہ چوک) فیصل آباد

ترتیب

***

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ چند

سورۂ کہف کا بنیادی موضوع تو وہ سوالات ہیں جو یہود نے اپنے راہب کے کہنے پر نبی ﷺ سے پوچھے تھے۔ غار والے...... ذوالقرنین اور روح کے بارے میں تفصیلات۔ لیکن جیسا کہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوبِ بیان ہے کہ وہ ایک ہی مسئلہ میں کئی مسائل بیان کر دیتا ہے، ایک واقعہ کے بیان میں بہت سی عبرتیں سمو دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اس نے یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان تین سوالات کے جواب میں اس نے..........

☆ اللہ کی وحدانیت

☆ نبیٔ رحمت ﷺ کی کامل عبدیت و بشریت

☆ علمِ غیب کی باتوں پر مزید بحث اور نکات تلاش کرنے کے بجائے ان کے ظاہری مفہوم کی حد تک ایمان لانا۔ (جیسا کہ اصحابِ کہف کی تعداد اور عرصۂ نیند کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے)

☆ کوئی بھی وعدہ یا کل کو کسی کام کے کرنے پر ان شاء اللہ کا لازمی طور پر کہنا

☆ زندگی اور موت کی حقیقت اور حیات بعد الموت پر ایمان

☆ دعوتِ حق

☆ نیک و بد اعمال

☆ اہل جنت کے اعمال

☆ سیدنا موسیٰ و سیدنا خضر علیہما السلام کا واقعہ اور اس میں ذکر عبرتیں۔

☆ اصحابِ کہف اور سیدنا ذوالقرنین علیہ السلام

☆ یاجوج ماجوج کا احوال

آخر میں اس سورۃ مبارکہ کا اختتام اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں کا عبرت ناک انجام، نیک اعمال کرنے والوں کا بہترین انجام، اللہ کے بے حد و حساب انعامات و

احسانات کو بیان کرنے اور لکھنے سے مخلوق کی عاجزی، اللہ کی وحدانیت اور اس سے ملنے کی خواہش کرنے والوں کو نیک اعمال کی ادائیگی اور صرف اسی کی عبادت کو لازمی قرار دینا...... جیسے عنوانات پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا موضوع سورہ کہف میں بیان کیے گئے واقعات اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج ہیں۔

مولانا آزادؒ نے ان تینوں عنوانات پر اپنے قلم و علم کے جوہر دکھائے ہیں اور مورخین و مفسرین نے جو نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں مصنفؒ نے انہیں اس قدر نکھار دیا ہے کہ اس بارے تمام شکوک و شبہات اور امکانات کو اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ اب شاید کوئی نئی بات دستیاب نہ ہو......

یاجوج ماجوج کے بارے میں تاریخ اور احادیث کی حوالے سے مختصراً تعارف کرایا جا سکتا ہے وہ یہ کہ:

☆ یہ اولادِ آدم ہی ہیں۔ انسانوں سے ماوراء کوئی مخلوق نہیں۔

☆ آج بھی موجود ہیں۔ اپنے وقت مقررہ پر اللہ کے حکم سے قربِ قیامت اہلِ دنیا پر وارد ہونگے۔ یہ وحشتناک فتنہ، فساد اور ہلاکت و بربادی کا باعث بنیں گے۔

☆ یہ اپنے گرد بنی ہوئی دیوار (جو حضرت ذوالقرنینؒ سیسے اور تانبے یا لوہے سے بنائی تھی) کو روزانہ چاٹتے ہیں اور جھلی برابر پتلی باقی رہنے پر پھر اگلی صبح کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ باقی کل کریں گے۔ لیکن اگلی صبح پھر جب اسے گرانے کے لئے آتے ہیں بحکم الٰہی وہ پھر اتنی ہی موٹی پاتے ہیں اور یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب اپنے وقت موعودہ پر مشیت ایزدی سے انشاء اللہ کہیں گے تب اگلی صبح وہ دیوار اتنی ہی پتلی پائیں گے جتنی چھوڑ گئے تھے تو باقی گرا کر باہر نکل آئیں گے اور دنیا والوں پر جھپٹ پڑیں گے۔

☆ یاجوج ماجوج نزولِ حضرت عیسیٰؑ اور خاتمہ فتنۂ دجال کے بعد خروج کریں گے۔

☆ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق نبیٔ رحمت ﷺ ایک روز نیند سے بیدار ہوئے خوف کے عالم میں فرمایا کہ عربوں کی تباہی ہے اس شر سے جو ان کے قریب آ چکا ہے۔ آج

یاجوج ماجوج کی دیوار میں اتنا سوراخ ہو گیا ہے پھر آپ ﷺ نے انگھوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر (دائرہ بنا کر) دکھایا۔

☆ یاجوج ماجوج کا مقابلہ کوئی بھی نہ کر سکے گا حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ بھی۔

☆ ان کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے ننانوے فیصد زیادہ ہے۔

☆ یہ دیوار سے باہر آ کر دنیا کا تمام پانی یکلخت ختم کر دیں گے۔ تمام سبزہ آن واحد میں کھا جائیں گے، انسانوں، حیوانوں اور چرند پرند کا بے پناہ خون بہائیں گے کہ کسی کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ پھر وہ آسمان کی طرف تیر برسائیں گے جو حکم الٰہی سے خون آلود ہو کر واپس آ گریں گے تو یہ خوشی سے کہیں گے ہم نے دنیا والوں کو بھی تباہ کر دیا اور آسمان والوں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔

☆ یہ سب بلا امتیاز جہنمی ہونگے۔

☆ حضرت عیسیٰؑ پھر دعاء فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے یاجوج ماجوج کی گردنوں میں کیڑے پیدا ہو جائیں گے اور وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے۔

☆ ان کی ہلاکت کے بعد دنیا پر صرف مسلمان ہی باقی رہیں گے۔ پھر یہ مسلمان کفر و شرک، بداعمالیوں میں مبتلا ہو جائیں گے، تو ان میں سے اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو اٹھا لیں گے اور برے لوگوں پر قیامت قائم کریں گے۔

☆ خلیفہ واثق باللہ نے اپنے زمانہ میں ایک لشکر محمد بن موسیٰ خوارزمی کی قیادت میں اس دیوار کی تلاش کے لئے روانہ کیا تھا جو دو سال کی تلاش کے بعد اسے پا لینے میں کامیاب ہو کر واپس آیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق یہ دیوار لوہے اور تانبے کی ہے اس میں نہایت مضبوط عظیم الشان دروازہ بھی ہے، جس پر منوں وزنی تالے پڑے ہوئے ہیں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث...... سام سے عرب نسل ہے، حام سے حبشی نسل اور مؤرخین کے نزدیک یافث کی نسل سے یاجوج ماجوج ہیں۔

علم و عمل کے بادشاہ، حریت ہند کے عظیم سپہ سالار امام الہند ابوالکلام آزادؒ جس عنوان

پر لب کشائی فرماتے ہیں اور جس موضوع کو اپنے قلم کا حسن بخشتے ہیں، بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کے لئے ابوالکلام آزادؒ سے کوئی بڑا آدمی ہی ہو تو بات بنے گی۔

اصحابِ کہف **طارق اکیڈمی** کی گنجِ گراں مایہ میں سے ایک قابل دید موتی ہے، ''**طارق اکیڈمی**'' پہلے بھی امام الہندؒ کے بے شمار علمی شاہپارے زیورِ طباعت سے آراستہ کر چکی ہے۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وطن عزیز میں پہلی بار امام الہندؒ کے علم وفکر کو حسنِ طباعت کی ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام عربی فارسی عبارتوں اور اشعار کا ترجمہ، آیات و احادیث کے حوالہ جات اور عبارتوں کو خوبصورت عنوانات سے مزین کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ''**طارق اکیڈمی**'' کا یہ کاروانِ علم وادب نئے چراغ روشن کرتا رہے اور علم کا نور پھیلانے کا یہ سفر معاشرے سے جہالت اور گمراہی ختم کرنے میں معاون ہو۔ نیز دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ادارہ کے تمام متعلقین کو رحمت و برکت سے نوازے۔ (آمین)

خالد اشرف (معاون خصوصی)

طارق اکیڈمی

10 جنوری 2003ء
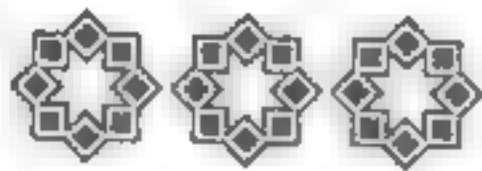
واقعہ اصحابِ کہف

(ایک جھلک)

سورۂ کہف آیت ۹ سے اصحاب کہف کی سرگذشت شروع ہوئی فرمایا:۔

یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا' اور ایک پہاڑ کے غار میں جاچھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے۔ آبادی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ زندگی کی کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ پھر وہ اٹھائے گئے۔ یعنی ظاہر ہوئے' اور یہ سارا معاملہ اسلئے ہوا کہ واضح ہوجائے دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو وقت کے واقعات اوران کے نتائج کا بہتر اندازہ کرسکتی تھی۔

دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کہف اور اُن کی قوم وملک کے لوگ ہیں۔

یہ گویا اس تمام معاملے کا ماحصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت ۱۳ میں فرمایا۔نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ "۔

(الف)

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشی کرلینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جاکر پوشیدہ ہوجانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی کہ

انہیں سنگسار کردے یا جبراً۔ اپنے دین میں واپس لے آئے۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

(ب)

جب وہ غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کیلئے بھیجا۔ اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن حکمت الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گی اور یہ معاملہ لوگوں کیلئے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔

(د)

اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں سات تھے۔ مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و وحشت سے تنگ آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی۔اور آبادیوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پاگئے اور ایک عرصہ کے بعد ان کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گذرا تھ۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افس میں بیان کیا جاتا ہے۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھ؟

قرآن نے کہف کے ساتھ "الرقیم" کالفظ بھی بولا ہے' اور بعض آئمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا۔ اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگادیا گیا تھا۔ اس لئے کتبہ والے مشہور ہوگئے۔

الرقیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم

ہو جاتا کہ "الرقیم" وہی لفظ ہے۔ جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے۔ اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا۔ جو آگے چل کر "پیٹرا" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اور عرب اسے "بطرا" کہنے لگے۔

عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک "پیٹرا" بھی ہے۔ اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا۔ اور اس کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا۔ تو یہاں کے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دُور دُور تک پہنچی۔ ۶۴۰ء میں جس مسلمان نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جارہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آرہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دُور دُور تک چلے گئے ہیں۔ اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ملا ہے۔ کہ جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں

شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہو گا۔ جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا۔ اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام "الرقیم" بتلادیا ہے۔ اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں۔ بغیر کسی بنیاد کے اسے " کتبہ " پر محمول کیا جائے۔ علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے۔ اور اسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ دُور کی باتیں ان کے علم میں آئی ہوں۔ پس ضروری ہے کہ یا قرب وجوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جاسکے۔ جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے ؟اگر اسے " پیڑا " کا واقعہ قرار دیا جاوے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا۔ یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر' ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی۔ اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقیناً نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہو گی اور انہی سے عربوں نے سنا ہو گا۔

خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔

اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی۔ جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مار مورا تک تعمیر کردی تھی[1] پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آ گیا ہو۔

اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں۔

اصل واقعہ

(الف) آیت ۹ "ام حسبت ان اصحب الکھف والرقیم کانوا مِنْ ایتِنا عجبا؟ کا اسلوب خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ" اصحاب الکہف والرقیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرت الٰہی کا ایک عجیب وغریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحی الٰہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کررہی ہے۔ چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلادیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت وتذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے۔ پھر۔ آیت (۱۳) میں فرمایا۔

نحنُ نَقُصّ علیكَ نباھُمْ بالْحقِ" اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنا دیتے ہیں یعنی واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کردیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

---

[1] جنگ کے بعد اس شاہرہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہوئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے۔ اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہوچکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے۔ وہاں پہلے ترسیس آباد تھا۔ جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے۔ اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے۔ تمام سرگذشت کا ماحصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہئیں فرمایا۔

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزین ہوگئے۔ ان کے پیچھے ظلم و ستم کی قوتیں تھیں۔ سامنے غار کی تاریکی 'وحشت' تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ "خدایا تیری ہی رحمت کا آسرا ہے اور تیری ہی چارہ سازی کا بھروسہ"۔ چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا' تاکہ واضح ہو جائے۔ ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عملی کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنی صورت حال نے دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک اصحاب کہف تھے ایک ان کے مخالف 'ایک نے حق کی پیروی کی دوسرے نے ظلم و تشدد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔ اس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا۔ کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے؟ اور کس نے کھویا ہے؟ کون ان دونوں میں وقت کا بہتر اندازہ شناس تھا؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحاب کہف نے اختیار کی تھی۔ کیوں کہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے

اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تو اب مسیحی ہونا کوئی نا قابل معافی جرم نہیں تھا' عزت و سربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔

صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ان پرستاران حق کی استقامت ہی تھی۔ جس نے دعوت حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباع حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔

(ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی ہیں۔ جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے۔ ان کی مخالفت میں تمام باشندے کمر بستہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے تو سنگسار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے منہ موڑیں۔ اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں معتکف ہو گئے۔

غار کی نوعیت:

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی' وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے۔ اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ تو چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال وجنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ' روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔

اس صورت حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ زندہ رہنے کیلئے وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے۔ کیونکہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے۔ مگر دھوپ کی تپش نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے جگہ کی کمی نہیں۔دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کیلئے اندر کا منظر بہت ڈراؤنا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لئے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں' اس لئے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے کی ملی جلی حالت رہتی ہے۔ اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو۔اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے باشندوں کا وہی حال ہوگا جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خداپرستی کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا' ان کے ایسے معتقد ہوگئے کہ ان کے غار نے زیارت گاہ عام کی حیثیت اختیار کرلی۔ اور امراء شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

(ج)اصحابِ کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ" فَضَرَبْنَا عَلٰی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا.(۱۱)ضرب علی اٰذانِ کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہوگئے تھے۔ یعنی دنیا کی کوئی

صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے۔ یعنی ان پر نیند طاری ہوگئی تھی۔اورچونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا۔ اسلئے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کیلئے" ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں یہ ایک طرح کااستعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو"ضرب علی الاذانِ" کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ التبعیّہ۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب کہف کاجو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوئے رہے۔ اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اسی طرح کی رواتیں مشہور ہوگئیں۔ عرب میں قصہ کے اصلی راوی شام کے نبطی تھے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جاکر منتہی ہوتی ہیں۔ جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہوچکے ہیں۔ مثلاً ضحاک اور سیدی۔ بہرحال اگر یہاں ضرب عَلی الاذان سے مقصود نیند کی حالت ہو' تو پھر مطلب یہ قرارپائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں میں پڑے رہے۔ اور"ثُمَّ بَعَثْنَا هُمْ کامطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہوگئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے۔ اور پھر بھی زندہ رہے' طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے۔ اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگراصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہوگئی ہو جس نے غیر معمولی مدت

تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ جزم ویقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔

(د) آیت ۱۸ "وَتَحْسَبُهُم اَيْقَاظًا وَهُم رقُودٌ" میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی۔ یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اسی میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کرگئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہوگئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کئے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں نہ کتا ہی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا۔ اگر "رقود" سے مقصود سونے کی حالت ہے 'اور وہ لیٹے ہوئے ہیں' تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا۔ لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا وہ اس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر ایک بے حس وحرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہوشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مرگیا ہے۔ مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا "نُقَلِّبُهُم ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ" کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی چونکہ

دائیں بائیں کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے' یہ بیدار ہیں۔ لیکن یہ توجیہہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے۔ اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہوں گے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں۔ اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے۔ لطف یہ ہے کہ "نَقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ" کی تفسیر میں یہی مفسر ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتی ہے بعضوں کے نزدیک ایک دفعہ بعض کہتے ہیں تین سال بعد' بعض کہتے ہیں نو سال بعد۔

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے۔ اس پر ان نکتہ سنجوں نے غور نہیں کیا۔ "لَوِاطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔" یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو۔ اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہوا' غار کے اندر اصحاب کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کردیا ہے جو بے حد دہشت انگیز ہے اگر آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے معاً الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہوسکے۔ علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ اتنا باریک بین نہیں ہوسکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اول نظر دیکھ لے۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ داہنے یا بائیں

کروٹ پر لیٹے ہوں۔

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخیل سے بالکل الگ ہوکر تحقیق نہ کی جائے۔ اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ وہ کس وقت کی ہے؟ اس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جاکر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی جب انکشاف حال کے بعد دوبارہ معتکف ہوگئے؟ مفسرین نے خیال کیا۔ اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے۔ اور یہی بنیادی غلطی ہے۔ جس نے سارا الجھاؤ پیدا کردیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے۔ یعنی جب وہ ہمیشہ کیلئے غار میں گوشہ نشین ہوگئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پاگئے۔ تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہوگئی تھی "تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًاوهم رقودٌ۔" میں ایقاظ" سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے۔ اور رقود' سے مردہ ہونا۔ نہ کہ بیدار اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی اور موت کیلئے یہ تعبیر عام معلوم ہوتی ہے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقع مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے۔ اور جنہیں پیش آیا تھا۔ وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہوجاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زندوانزدا کی ایک خاص زندگی شروع ہوگئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ لوگ ترک علایق کے بعد کسی پہاڑ میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہوجاتے تھے۔

اور پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع ونشت کی جو حالت اختیار کر لیتے' اس میں پڑے رہتے' یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے' تو برابر کھڑے ہی رہتے' اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے۔ اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی۔ کیونکہ عیسائیوں میں تعبدو تضرع کے لئے یہی وضع رائج ہو گئی تھی[1]۔

غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پرواہ ہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچادیا کرتے' نہیں ہوتی تو یہ جستجو نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی۔

جیسی ہندوستان کے جوگیوں کی رہ چکی ہے۔ اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے۔

جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔ اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرات نہ کرتا۔ مدتوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے تھے۔ اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی۔ تو صدیوں تک

---

[1] عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی۔ کیونکہ یہودیوں کے اوضاع نماز میں اس وضع کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہم نماز میں کیا کرتے ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں نے بندگی و نیاز مندی کے اظہار کیلئے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے۔ اور بادشاہ کے قدموں یا دامن کو بوسہ دیتے۔ مجرموں کے لئے بھی ضروری تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ گھٹنے ٹیک کر سنیں۔ مصر' بابل اور ایران میں سجدہ کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے منہ ہو کر بالکل لیٹ جانے کی۔

ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلہ سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ ڈٹیکان کے تہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں۔ جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے۔ اوراپنی اصل وضع وہیئت پر باقی تھے۔

ابتدامیں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے کھنڈراختیار کیے گئے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں۔ کہ ان میں آمدورفت کیلئے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا 'کیونکہ جو جاتا تھا' وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی' جو ہوااور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچادیتے۔

بعدکوجب مناسٹک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہوگئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمنہ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا۔ اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جواس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کوعام طور پر **Logette** کہتے تھے اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر لاطینی لفظ کندہ کر دیاجاتا کہ۔ **TU-ORA** یعنی اس کیلئے دعا کرو۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی۔اور اس کا بڑا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی۔ اور سینٹ بنی ڈکٹ**Benedict**نے سب سے

پہلے اس کے قواعد وضوابط منضبط کئے۔ سینٹ بنی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتدا اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کرلی۔ یعنی ابتداء میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم وتشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ اضطراری طریقہ زہدو تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورۃ حدید کی تشریحات میں ملے گی۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتدا میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے تو زہد وعبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی۔ لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر وعبادت کی جو وضع اختیار کرلی تھی۔ وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کیلئے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اس کے مالک مر گئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت

انگیز نوعیت پیدا کرلی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے کوئی سجدے میں پڑا ہے' کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے' وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اٹھے۔ کیونکہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مُردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

(ز) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو' ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام قفلوں کو کھلنے کیلئے صرف ایک کنجی کا انتظار تھا۔ "تَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَهُمۡ رُقُودٌ کا مطلب بھی ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دوراز کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ نہیں "لَوِاطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں۔ جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہو گا؟ یقیناً مارے دہشت کے چیخ اٹھو گے۔ اسی طرح " وَنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ "کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہیں رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے۔ جیسا کہ آیت "وَتَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ" سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی۔ اور ان

کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے
اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں۔ جیسا کہ سورۃ کہف کی آیت ۱۷ میں ہے اور کیوں اسے قدرت الٰہی کی ایک نشانی فرمایا کہ " ذٰلكَ مِنۡ اٰيَاتِ اللّٰهِ؟" معلوم ہو گیا کہ دراصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ "تحسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُم رقُودٌ۔" یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں۔ حتیٰ کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس لئے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی۔ لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزر نہ تھا۔ جو چیز نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے۔ اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی' روشنی پہنچتی رہتی۔ مگر تپش سے پوری حفاظت تھی۔ "ذٰلكَ مِنۡ اٰيَاتِ اللّٰهِ"۔

(ح) "وَلَبِثُوافِیۡ كَهۡفِهِم ثَلاثَ مِائَةٍ سِنِيۡن وَازۡدَادُوا تِسۡعًا۔" کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے۔ کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ "قُلِ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا۔" مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت

عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کئے تھے۔ اسی طرح یہاں مدت بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں 'غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نوسو برس اور بڑھا دیئے۔ تم کہدو اللہ ہی بہتر جانتا ہے' کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے 'لوگوں کا قول ہے۔ اور "سَیَقُوْلُوْنَ" سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اسی سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔

(ط) امام قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ "اولئِك قوم فنواوعدموامنذمدة طويله" یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ ان کے اجسام فنا ہوگئے۔ جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزوات میں بعض صحابہ کا گذر اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا۔ اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیڑا میں پیش آیا تھا۔ مسیحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو اشارات کئے گئے ہیں' ان کی تفصیلات کیلئے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہیں۔

The Pardise of Garden of the Holy Fathers
By E.A.W. budge.
The Eoolution of the Menastiol Deal
By H. Workman
Tive centuries of Religion
By G.G. Coulton.
The Mediovai Mind By H.O. Taylor.

سورۃ کہف میں تیسرا واقعہ جو بیان کیا گیا ہے' وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیونکہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً مشرکین مکہ کی زبانی ہوا۔ کیونکہ سورت مکی ہے۔

قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے۔ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے' پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے۔ کیونکہ فرمایا" وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْن

ثانیاً' اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کیلئے ہو سکتا تھا' اس کیلئے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کیے' پھر مشرقی پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا۔ جہاں پہاڑی درہ تھا۔ اور اس کی دوسری طرف یاجوج اور ماجوج آ کر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً اس نے وہاں ایک محکم سد تعمیر کر دی اور یاجوج وماجوج کی راہ بند ہوگئی۔

خامساً' وہ ایک عادل حکمران تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دُور تک چلا گیا' تو ایک قوم ملی۔ جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کیلئے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے۔ ان کیلئے ویسا ہی اجر بھی ہو گا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم و

بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادسًا۔ وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعًا۔ وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا کہ یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں۔ ہم خراج دیں گے۔ تو اس نے کہا" مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ "جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے کام نہیں کروں گا۔ اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی سینگ کے ہیں۔ پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگوں والا۔ لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو۔ اس لئے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے۔ اس لئے متاخرین کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور اگرچہ حسب عادت وہ تمام اعتراضات نقل کر دئے ہیں جو اس مدعا تفسیر پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن پھر حسب عادت انکے بے محل جوابات

پر مطمئن بھی ہوگئے ہیں۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کاذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا،نہ عادل تھا، نہ مفتوح قوموں کیلئے فیاض تھا، اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی۔

بہر حال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے۔

دانیال نبی کا خواب

اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف ایک دور کا اشارہ تھا۔ جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کیلئے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی' ان کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا' ان کے شہر اجاڑ تھے اور وہ نہیں جانتے تھے۔ کہ اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا۔ جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہان بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہیں کی نسبت تورات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بیلش فار" شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرے برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اس خواب میں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔ چنانچہ کتاب دانیال میں ہے۔

"میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ جس کے دو سینگ اونچے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پچھم اترا اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا۔ اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا۔ کہ دیکھا پچھم کی طرف سے

ایک بکرا آ کے تمام روئے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا۔ اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے"۔

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی بادشاہت ہے۔ اور بال والا بکرا یونان کی جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے۔ وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں ملکر ایک شہنشاہی بننے والی تھی۔ اس لئے شہنشاہ مادہ وفارس کو دو سینگوں اور مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا۔ پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا۔ یعنی سکندر مقدونی تھا۔ جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہوگیا۔

اس خواب میں بنی اسرائیل کیلئے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی وخوش حالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا۔ یعنی شہنشاہ فارس بابل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا۔ اور پھر اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی۔ چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا۔ اس نے میڈیا اور پارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی۔ اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کیلئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تصور پیدا ہو گیا ہو۔ یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے۔ اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا۔ اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا۔ بلکہ خود سائرس کا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے شک و تخمین کے تمام پردے اٹھا دئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو استخر Pasargadoe کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اوپر خط منحنی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے۔ مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کیلئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا۔ اور یقیناً سائرس کو "ذوالقرنین" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پردوں کا ہونا اسکے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک

غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔

دو سینگوں کا تخیل ابتداء میں کیونکر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد دانیال نبی کا خواب تھا۔ یا بطور خود سائرس نے یا باشندگان پارس نے یہ تخیل پیدا کیا؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر آرٹازرکیسز[1] (ارتخششت) اول تک تمام شہنشاہان پارس انبیاء نبی اسرائیل سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس لئے ہو سکتا ہے کہ اسی خواب سے "ذوالقرنین" کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔

بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ کہ سائرس کو "ذوالقرنین" سمجھا جاتا تھا۔ اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکارا کرتے تھے۔

(ب) اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے۔ اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم و گمان بھی کیا جا سکے۔

---

[1] یاد رکھنا چاہیئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غالباً گوردیا گوروش تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبۂ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونانی اسے سائرس Cyrus کہنے لگے۔ اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ یسیاہ ارمیا اور دانیال کے صحیفوں میں جا بجا یہ نام آیا ہے۔ اور یہی گورش ہے۔ جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب مورخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

سائرس کا لڑکا کیم بی سیز Cambyses ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کیوچیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر یہ کیقباد کی شکل اختیار کی۔ شاہنامہ نے بھی اسی کو اختیار کیا۔ کیونکہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقباد کے بعد داریوش ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد آرٹازرکیسز ہے۔ اسے تورات میں ارتخششت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور عربوں میں اُردشیر مشہور ہو گیا۔

زمانہ حال کے محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد حملہ' اسکندر سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پارتھوی یا ملوک الطّوائف کا۔ تیسرا ساسانی سلاطین کا۔ فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے۔ جو حملہ اسکندر سے پہلے گزرا۔ اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے براہ راست ذرائع مفقود ہوگئے ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں۔ تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ معتمد تین مورخ ہیں۔ ہیروڈوٹس **Herodotus** ٹی سیاز **Ctesias** اور زینوفن **Xenophon** فتح ایران کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنی چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں حملہ اسکندر سے پہلے کا زمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے۔ جس طرح ہندوستان پر پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور رامائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روائتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں۔ جب دقیقی اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں یہی مواد ملا۔ اور اسی کو انہوں نے نظم کا جامہ پہنادیا۔ پس یہ تمام ذخیرہ قبل از سکندر عہد کیلئے کچھ سودمند نہیں ہے۔ اور سائرس کے حالات کیلئے ہمیں تمام تر یونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت مسیح سے پانچ سو ساٹھ برس پہلے ایران کی سرزمین دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا اور شمالی مغربی میڈیا۔ چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی

تھیں۔اس لئے قدرتی طور پر یہ ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امرا تھے۔جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔

612 قبل مسیح میں جب نینوا تباہ ہو گیا۔ اور آشوری فرمانروائی ہمیشہ کیلئے ختم ہوگئی۔ تو میڈیا کے باشندے آزاد ہوگئے۔اور بتدریج ایک قومی حکومت نشوونما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ اور حکمران خاندان پیدا ہو گیا۔ تاہم یہ دونوں مملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت نصر کی قہارانہ فتح مندیوں نے تمام ایشیاء میں سربلند کردیا تھا۔ سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

---

[1] دارا کتبہ بے ستون میں اس کا نام مادا آیا ہے۔اس لئے میڈیا نویانی تلفظ سمجھنا چاہیے۔ عرب مورخوں نے اسے ماہات سے تعبیر کیا ہے۔
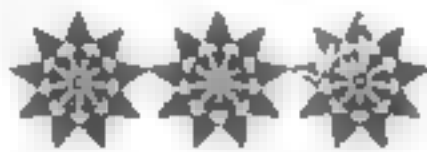
لیکن ۵۵۹ قبل از مسیح میں ایک غیرمعمولی شخصیت ‘غیر معمولی حالات کے اندر اُبھری اوراچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ پارس کے ”ایکے می[1] نیز خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا۔ جسے یونانیوں نے سائرس ‘عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کیخسرو کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروا تسلیم کرلیا۔ پھر بغیر کسی خونریزی کے میڈیا کی مملکت پر فرمانروا ہو گیا۔

اوراس طرح دونوں مملکتوں نے ملکر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کرلی۔

پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔وہ فتوحات نہیں جو ظلم وقہر کی خونریزیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں۔ بلکہ انسانیت وعدالت کی فتوحات جو تمام تر اس لئے تھیں کہ مظلوم قوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں

[1] دارا نے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلہ ہخامنش نامی بادشاہ سے ملایا ہے۔ یہی ہخامنش یونانی (Achacmenes) ہو گیا۔ ہیروڈوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پڑدادا تھا۔ یعنی ایکے منی نیز سے (چائش پش) پیدا ہوا۔ اس سے کم بی سیز (کمبوجیہ یا کیقباد) اول اور کم بی سیز سے سائرس نے اپنے بڑے لڑکے کا نام بھی کم بی سیز رکھا تھا۔

کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکڑیا(بلخ) تک ایشیاء کی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سربسجود ہو چکی تھیں۔

دنیا کی تمام غیرمعمولی شخصیتوں کیطرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پُراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کرلی ہے اور ہمیں اس کی جھلک شاہنامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آجاتی ہے۔ اس کا اُٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو اس کے نانا اسٹیاگس (Astyages) نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا۔ لیکن وہ ایک حیرت انگیز طریقے پر بچا لیا جاتا ہے۔ اور اس کی ابتدائی زندگی جنگوں اور پہاڑوں میں بسر ہوتی ہے۔ پھر ایک وقت آجاتا ہے کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائل اسے ملک میں نمایاں کرتے ہیں اور اس کی خاندانی شخصیت پہچان لی جاتی ہے۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے۔ لیکن اسے ایک لمحہ کیلئے بھی اس کا خیال نہیں گزرتا۔ حتیٰ کہ خود اسٹیاگس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں میں محفوظ رہتی ہے۔

تخت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیڈیا (Lydia) کے بادشاہ کروئسیس (Crocous) سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کروئسیس کی طرف سے ہوا تھا۔ اور اس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈیا سے مقصود ایشیائے کوچک کا مغربی و شمالی حصہ ہے۔ جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا۔ اور اس کی حکومت

بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی۔ جنگ میں سائرس فتح یاب ہوا۔ لیکن رعایا کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب جنگ کی حالت سے گزر رہا ہے۔ البتہ کروئسس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اسکے عزم وہمت کی آزمائش کیلئے سائرس نے حکم دیا تھا چتا تیار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے۔ تو فوراً اس کی جان بخشی کردی۔ اور اس نے بقیہ زندگی عزت احترام کے ساتھ بسر کی۔

اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ گیڈروسیا (مکران) اور بکڑیا (بلخ) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی یہ مہم ۵۴۰ اور ۵۴۵ قبل مسیح کی درمیانی مدت میں واقع ہوئی ہوگی۔

تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی ہے کہ بیل شازار (Belshzzar)[1] کے مظالم سے انہیں نجات دلائے

نینوا کی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کردی تھیں اور بنوکدرزار (بخت نصر) کی قاہرانہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیاء کو مسخر کرلیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ

---

[1] دانیال نبی کی کتاب میں اسے جابجا "بنیش فار" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ لیکن بابل کے کتبوں نے اس کا صحیح نام جو معلوم ہوا ہے یہی ہے علاوہ بریں معلوم ہوتا ہے کہ نوشتہ کے لکھنے والوں نے سائرس اور دارا کے دو مختلف حملوں کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ اور کہیں سائرس کی جگہ دارا کا نام آگیا ہے۔ کہیں دارا کی جگہ سائرس کا تاریخی حیثیت سے جو واقعہ ثابت ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بابل پر فارس کے دو حملے ہوئے ہیں پہلا سائرس نے کیا اور دوسرا دارا نے۔ سائرس نے بابل فتح کرکے اس کی اندرونی حکومت وطنی اُمرا کے ہاتھ چھوڑدی تھی۔ پھر تقریباً بیس برس بعد امراء بابل نے بغاوت کی اور دارا مجبور ہوا کہ دوبارہ بابل کو فتح کرے۔

ہے۔وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ قوموں کو غلام بناتا اور ملکوں کو تباہ کرڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جو یانہ قوتوں کی جانشیں ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندروں کے پجاریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونی دس۔(Nabonidus) کو تخت نشین کیا تھا۔ لیکن اس نے حکمت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا۔جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا۔ اسی کی نسبت دانیال نبی کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی۔ اور ایک غیبی ہاتھ نے نمایاں ہو کر "منے سنے تقیلؔ اور فیرسین" کے الفاظ دیوار پر لکھ دیئے تھے۔(دانیال ۵:۱) تمام مورخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور نا قابل فتح کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی' تہ در تہ اور اونچی تھی کہ اسے مسخر کرنے کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بایں ہمہ سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور دوآبہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔چونکہ خود باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آگئے تھے اور سائرس کیلئے چشم براہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔ خود بابلی حکومت کا ایک سابق گورنر گوب زیاس(Gobryos) اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص نے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا۔ اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے' شہر فتح ہو چکا تھا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح نبی

اسرائیل کیلئے زندگی وخوش حالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے ساٹھ برس پہلے وحی الہٰی سے مطلع ہوکر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی۔ یہودیوں کو یوروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی۔ نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ ”خدا نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ یروشلم میں اس کیلئے ایک ہیکل بناؤں (یعنی قدیم برباد شدہ ہیکل سلیمان کو از سرنو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کا ساز وسامان اس کیلئے مہیا کرنا چاہیے“ اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بنو کدرزار ہیکل سے لوٹ کرلایا تھا۔بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بفر کے حوالے کردیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور رکھ دیئے جائیں۔(عزرا۔باب اول)

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیاء میں مسلم ہوگئی۔ ۵۳۹ ق م میں صرف اس کی تنہا شخصیت عظمت وحکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا۔ لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہا فرمانروا ہے جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندیوں کا مرکز رہ چکی ہیں۔ فتح بابل کے بعد وہ تقریباً دس برس تک زندہ رہا اور ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال کرگیا۔

اب قبل اسکے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے۔ تو اس بات پر غور کرلینا چاہیے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں۔ اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی ہے جن کا ظہور سائرس کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے۔ کہ بابل کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلہ میں خورس (سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

"خداوند تیرا نجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ "یروشلم پھر آباد کیا جائے گا یہودا کے شہر بنائے جائیں گے۔ میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا۔ میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے۔ وہ میری ساری مرضی پوری کریگا۔ خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ "میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا تاکہ قوموں کو اس کے قابو میں کردوں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوادوں۔ اور دہرے دروازے اس کیلئے کھول دوں۔ ہاں میں تیرے آگے چلوں گا۔ میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے گنج تجھے عطا کردوں گا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں۔ جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کیلئے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔

(یسعیاہ ۲۱ : ۲۴)

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ خورس (سائرس) میرا چرواہا ہوگا۔ اور میں نے اسے اس لیے پکارا ہے کہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اسے "خدا کا مسیح" بھی کہا ہے۔

اسی طرح یرمیاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"قوموں کے درمیان منادی کردو۔ اور اسے مت چھپاؤ۔ تم کہو بابل لے لیا گیا، بعل رسوا ہوا" مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بت خجل ہوئے، اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ اتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے۔ جو اس کی سرزمین اجاڑدے گی۔ یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں رہے گا"(۵۰:۱)

یرمیاہ نبی نے اس کی بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ ستر برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے۔ اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہوگی۔ "خداوند کہتا ہے جب بابل پر ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکارو گے۔ اور میں جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور مجھے پالو گے۔ میں تمہاری اسیری ختم کردوں گا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا"۔(۲۹:۱)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کردیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہوگا۔ جو بنی اسرائیل پر لوٹ آئے گا۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دانیال نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہوئے تھے) اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھلائی کہ ایک سو ساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے تعمیر ہیکل کیلئے جاری کیا تھا۔

زمانہ حال کے نقاد ان پیشین گوئیوں کی اصلیت پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ پیشن گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد

بڑھادی گئیں ہوں۔ خصوصاً یسعیاہ کی پیشین گوئی جس میں صریح خورس (سائرس) کانام موجود ہے۔ لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغراب کے سوااور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اور محض عقلی استغراب ان صحائف کے خلاف حجت نہیں ہوسکتا۔ جنکی نسبت یقین کیاگیاہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے۔ علاوہ بریں تورات کے آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثناء میں یااسیری بابل کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کرلئے گئے ہیں کیونکہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں متداول رہے۔ اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ انکے نسخے نابود ہوگئے ہوں۔ ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں بھی دانیال نبی کے خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتلایا گیا ہو۔ صرف قوم وملک کاذکر ہوا اور بعد کو یہ نام بڑھادیاگیاہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کاعام اعتقاد برابر ہی رہا کہ سائرس کاظہور نبیوں کی پیشین گوئی کے مطابق ہواتھا۔اور وہ خدا کی ایک پسندیدہ ہستی تھی۔ جواس لئے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی داد رسی ہو اور بابلیوں کے ظلم وشرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

❋❋❋

قرآن کی تصریحات اور سائرس

اب غور کرو۔ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ہم نے اس مبحث کے آغاز میں تصریحات قرآنی کا خلاصہ دے دیاہے جوسات دفعات پر مشتمل ہیں۔ ان پر پھر ایک نظر ڈالو۔

ا۔ سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالا تفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی تووہ صرف سائرس ہی کی تھی۔ نبیوں کی پیشین گویئوں کا مصداق دانیال نبی کے خواب کا ظہور' رحمت الٰہی کی واپسی کی بشارت نبی اسرائیل کا نجات دہندہ' خداکافرستادہ چرواہا اور مسیح' یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ 'پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو؟

سدی کی ایک روایت میں بھی جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے اس طرف صریح اشارہ ملتاہے ۔ قَال قالتِ الیھُودُ": اَخبرنَاعنَ نَبِیّی لَم یَذْکُرہُ اللّٰہُ فِی التَّورَاتِ اِلَّافِی مکَانٍ واحِدٍ" قَال:وَمَنْ؟ قَالُوا ذُوالقَرنَینِ۔یعنی یہودیوں نے آنحضرت سے کہا: اس نبی کی نسبت ہمیں خبر دیجئے جس کا نام تورات میں صرف ایک ہی مقام پر آیا ہے۔ آپ

نے فرمایاوہ کون؟کہاذوالقرنین۔چونکہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دانیال نبی کے خواب ہی میں آیا ہے۔اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔

علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کردی ہے کہ اسکے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اورمادہ کی مملکتوں کے اجتماع واتحاد کی علامت تھی۔

۲۔اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ۔ سب سے پہلا وصف جواس کا بیان کیاہے یہ ہے کہ "اِنَّامَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا" (۸۴)

ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی۔ اور ہر طرح کا سازوسامان مہیاکردیاتھا۔ قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی وخوشحالی کوبراہ راست خدا کی طرف منسوب کرکے کہتاہے' جیسا کہ یہاں آیا ہے۔تواس سے مقصود عموماًکوئی ایسی بات ہوتی ہے جوعام حالات کے خلاف محض اس کے فضل وکرم سے ظہور میں آئی ہو۔مثلاً حضرت یوسفؑ کی نسبت فرمایا:" كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ "(۱۲:۵۶)

اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کوحکومت دے دی۔ "ہم نے دے دی" کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسف کو ہر طرح کے ناموافق حالات میں محض فضل الٰہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہوگئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو۔ پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کامقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں۔ اورانہیں محض توفیق الٰہی کی کرشمہ سازی

سمجھا جا سکے۔ کیونکہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو' خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ ایک وفادار آدمی اس کی زندگی بچاتا ہے۔اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گذریے کیطرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ و مقاتلہ کے میڈیا کا تخت اس کیلئے خالی ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ صورت حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔ نوادرِ ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے۔ اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے' تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

(۳)اس کے بعد اس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس[1] کی طرف یعنی پچھم کی طرف ایک مطلع الشمس کی طرف' یعنی یورپ کی طرف تیسری ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی۔ اور یاجوج اور ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کسطرح ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

---

[1] یاد رہے کہ پچھم اور یورپ کیلئے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں بھی جا بجا آئی ہے۔ مثلاً ذکریاہ کی کتاب میں ہے۔"رب الافواج فرماتا ہے میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑالوں گا"۔(۸:۷)

مغربی مہم:

او پر پڑھ آئے ہو کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروسس نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کوچک کی یہ بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور ہوئی۔ پچھلی صدی کے اندر ابھری تھی۔ اس کا دارالحکومت سادریس (Sardio) تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے میدیا اور لیڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ بالآخر کروسس کے باپ نے سائرس کے نانا اسیاکس کے باپ سے صلح کر لی۔ اور باہمی اتحاد کے استحکام کیلئے باہمی ازدواج کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروسس نے یہ تمام عہد وپیماں اور باہمی علائق بھلا دیئے وہ سائرس کی کامرانی برداشت نہ کر سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اس نے پہلے بابل مصر اور اسپارٹا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پیڑیا (Pteria) پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میدیا کے دارالحکومت ہمتانہ سے[2] (جواب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔) نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد پیڑیا اور سارڈیس ۔ ق ـ وقع ہوئی تھیں۔ لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا۔

ہیرو ڈوٹس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں لیکن یہ

---

[2] دارا کے کتبوں میں اس کا نام ہمتانہ آیا ہے مگر ہیرو ڈوٹس وغیرہ یونانی مورخین نے اسے اک بتانا (Acbatana) لکھا ہے۔ اور یہی نام یورپ میں مشہور ہو گیا تھا۔

موضوع اطناب کا نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ سائرس کی فتح مندی بڑی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پیریا کے معرکوں کے بعد صرف چودہ دن کے اندر لیڈیا کا مستحکم دارالحکومت مسخر ہو گیا اور کروسس ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے سائرس کے آگے سرنگوں کھڑا تھا۔

اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے لے کر بحر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اس طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال پہلے طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتح مند قدموں کیلئے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں رکاوٹ نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے لیکر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ لیکن سمندر کی موجوں پر چلنے کیلئے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔

یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی صرف مغرب کی لشکر کشی تھی کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کیلئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو۔ تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی سی شکل دے دی ہے۔ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا۔ اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت فاصلہ پر

نہ تھا۔ پس جب سائرس سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقینا بحرا ئیجین کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہوگا جو سمرنا کے قرب وجوار میں واقع ہے۔یہاں اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کرلی ہے۔ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے۔ اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی صورت حال کو قران نے ان لفظوں میں بیان کیا۔"و جدھا تغرب فی عین حمئة (۸۶)

اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔ یہ ظاہر کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

مشرقی مہم:

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیروڈوٹس اورٹی سیاز! دونوں اس کی مشرقی لشکر کشی کاذکر کرتے ہیں۔ جولیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی۔ اوردونوں نے تصریح کی ہے کہ " مشرق کے بعض وحشی اور صحرا نشیں قبائل کی سرکشی اسکاباعث ہوئی تھی"۔ یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس ارشاد کی تصدیق ہے کہ حتیٰ اذابلغ مطلعَ الشّمس وجدھا تطلع علی قومٍ لم نجعل لھم مِن دُونھا ستراً"۔(۹۰) جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تواسے ایسی قوم ملی جو سورج کیلئے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔یعنی خانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ان مورخین کی صراحت کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو

صاف نظر آجائے گا کہ بکڑیا ٹھیک ایران کیلئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈروسیا کے وحشی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی۔ اوران کی گوشمالی کیلئے اسے نکلنا پڑا۔ گیڈروسیا سے مقصود وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی طرف ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے نیچے اس کے قدم نہیں اترے ہوں گے۔ اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے
آگے نہیں بڑھے ہونگے کیونکہ دارا کے زمانہ میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

شمالی مہم:

تیسری لشکرکشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (اکاسپین) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا (Caucasus) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا۔ اوروہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ اسی راہ سے یاجوج ماجوج آکر اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے۔ اور یہیں اس نے سد تعمیر کی۔

---

[1] ٹی سیاز (Ctesios) ایک یونانی تھا جو ۳۹۸ قبل مسیح سے لے کر ۴۱۴ ق م تک شہنشاہان پارس کا دربار طبیب رہا اور اس زمانہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھی۔ بعد کے یونانی مورخوں نے اس کے بعض بیانات شک کی نگاہ سے دیکھے ہیں۔ اور اس لئے اسے استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہوسکا جو ہیرودوٹس (المتولد ۸۴ ق م) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے۔ مگر ...... زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ "حتی اذا بلغ بین السدین وجدمن دونھما قوما لا یکادون یفقھون قولا" (۹۳) یہاں تک کہ وہ دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات سمجھ نہیں سکتی تھی۔ پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ "سدین" سے مقصود کاکیشیا کا پہاڑی درہ ہے کیونکہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے۔ جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔ بائیں جانب بحر اسود ہے جو شمال مغرب کیلئے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر بفلک سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے۔ پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کیلئے کوئی راہ باقی رہی تھی تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی۔ اور یقیناً وہیں سے یاجوج ماجوج کو دوسری طرف پہنچنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لیکر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا۔ بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا۔ اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران شام' عراق' عرب' ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔

نقشہ میں یہ مقام دیکھو' تمام مغربی ایشیا نیچے ہے۔ اوپر شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے بائیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کاکیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے۔ اب اس روک میں اگر کوئی شگاف رہ گیا تھا۔ جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس روک کو لانگ سکتے تھے۔ تو صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔ ذوالقرنین نے

اسے بھی بند کر دیا۔ اور اس شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھاٹک پوری طرح مقفل ہو گیا۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی۔ اور جو بالکل ناسمجھ تھی۔ وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلے میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا۔ تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے۔ پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے "کاسپین" کے نام سے پکارا ہے۔ اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام سپین پڑ گیا۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کاکیشیا کے دامن میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے "کولچی" "کول شی" کے نام سے پکارا ہے۔ اور دارا کے کتبہ اسطخر میں اس کا نام "کوشیہ" آیا ہے[1]۔ ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یا دونوں قوموں نے ذوالقرنین سے یاجوج ماجوج کی شکایت کی ہوگی۔ اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں۔ اس لئے ان کی نسبت فرمایا کہ "لایکادون یفقھون قولاً۔

(۴) اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی اس

[1] دارایوش اول کا یہ کتبہ تاریخ قدیم کا ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ اس میں اس نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور زیر حکومت صوبوں کے نام گنائے ہیں جو تعداد میں ۲۸ ہیں۔ اکثر ناموں کا جغرافیائی محل روشنی میں آچکا ہے۔ صرف ایک دو ناموں کی حقیقت اب تک محل غور و بحث ہے!۔

کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا۔" یاذاالقرنین امّا ان تعذّب وامّاأن تتّخذ فیھم حسنا (۸۶) یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ خواہ سزا دے خواہ انہیں اپنا دوست بنالے۔ یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے بادشاہ کروئسس نے تمام عہد و پیمان اور باہم رشتہ داریاں بھلا کر بلاوجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا۔ اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وقت کی تمام طاقت ور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائید الٰہی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور لیڈیا مسخر ہو گیا۔ تو حکم الٰہی ہوا۔ یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ جس طرح تو چاہے ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائید الٰہی نے تیرا ساتھ دیا دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں۔ لیکن تجھے بدلہ نہیں لینا چاہیے۔ وہی کرنا چاہیے جو نیکی اور فیاضی کا مقتضا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا" قال امّامن ظلم فسوف نعذّبه ثم یردالی ربه فیعذبه عذابا نکراً واما من اٰمن وعمل صالحاً فله حزاء الحسنی وسنقول له من امرنا یسراً (۸۸) اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنا پر کسی کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کرے گا بلا شبہ اسے سزا دوں گا۔ پھر اسے مرنا ہے۔ اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے۔ اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے۔ اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو ان کیلئے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہو گا۔ اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ میں بندگان خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اس

طرزِ عمل کی تعبیر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کرلیا ہے۔

تمام یونانی مورخ بالا تفق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمن کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا۔ کیونکہ زیادتی ان کی ہی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا۔ اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ سائرس نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ جھکادے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ کرونسس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اسے گزند نہ پہنچائی جائے۔ اگر وہ مقابلہ کرے جب بھی اس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیے اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی کہ باشندگان کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرمان روا خاندان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کرونسس کی جگہ سائرس نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سائرس کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی۔ کیونکہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کرونسس کو نہ بچا سکے' حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندروں کے ہاتفوں سے استصواب کرلیا تھا اور ڈلفی کے ہاتف نے فتح کامرانی کی بشارت دی تھی۔ پس قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کیلئے خوشگوار نہ ہو سکی۔ اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ

اس شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتح مندی کی شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کروئسس کا معاملہ اچانک ایک پراسرار افسانہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اور یونانی دیوتا اپنے سارے معجزوں کے ساتھ نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہیروڈوٹس[2] لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈلفی کے ہاتف کا جواب غلط نہ تھا مگر کروئسس نے جنگ کے جوش وطلب میں اس کا صحیح مطلب نہ سمجھا۔ ہاتف نے کہا تھا کہ اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دے گا۔ مگر اس نے خیال کیا بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز وہ کہتا ہے پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتا تیار کی جائے اور اس پر کروئسس کو بٹھا کر آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ لیکن پھر جب کروئسس کی بعض باتیں سنیں تو بیحد متاثر ہوا۔ اور آگ بجھانے کا حکم دیا۔ لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو چکی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسے فوراً بجھایا جائے۔ یہ حال دیکھ کر کروئسس نے اپالو دیوتا کو پکارا۔ اور باوجود آسمان بالکل صاف تھا اچانک بارش شروع ہوگئی اور اس طرح اس معجزے نے بروقت ظاہر ہو کر اس کی جان بچالی۔

لیکن خود ہیروڈوٹس اور زینوفن کی تصریحات سے جو حقیقت معلوم

---

[1] ہم نے Oracle کیلئے ہاتف کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اس کیلئے مرادف لفظ نہیں ہے۔ لیکن اصطلاع کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتف غیبی کی صدائیں سنی جاتی ہیں۔ اور خاص پجاریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور مجاور دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنادیتے۔

[2] ہیروڈوٹس مترجمہ اے ڈی گاڈلی (Godley) Lueb Edition

ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کروسس کے عزم وصبر کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ یا یہ بات آشکارا کر دینا چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔اور جن دیوتاؤں کی مزعومہ بشارت پر اعتماد کر کے جنگ کی گئی تھی' ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچالیں۔ یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے چتا پر بٹھایا جائے' آگ بھی لگادی جائے۔ لیکن جب وہ خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر اسے بخش دے۔ اور عزت و آرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے۔ دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے' کیونکہ خود ہیروڈوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے' اور یونانی افسانہ میں اپالو کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی۔ یونانی افسانہ نے اس کا توڑ کرنے کیلئے اپالو کا معجزہ گھڑ لیا۔

قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا سزا پائے گا۔ جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہوگا اسے انعام ملے گا۔ بعینہٖ زینوفن کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں ہے کہ "وسنقول له مِنْ اَمْرِنَا یُسْراً۔ اگر لوگوں نے نیک عملی اختیار کی' تو دیکھ لیں گے میرے احکام و قوانین میں ان کیلئے سختی نہ ہوگی۔ تمام مورخ بالا تفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کیلئے سر تا سر شفقت و مرحمت تھا۔ اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی۔ جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے' اس نے جس قدر احکام و فرامین نافذ کیے وہ زیادہ سے زیادہ نرم

اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

(۵) یہ تو صرف اس کی مغربی فتح مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں' یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے' ہم وطن نہیں تھے اور ہم مذہب نہیں تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی۔ اور لیڈیا کی شکست یونانی قومیت' یونانی تہذیب اور سب سے زیادہ یہ کہ یونانی مذہب کی شکست تھی۔ پھر سائرس کے جانشینوں نے براہ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا۔ اور ہمیشہ کیلئے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہوگا۔ تاہم' ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفتوں کی مدحت سرائی میں رطب اللسان ہے اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالمگیر اعتراف و تاثر کی نوعیت اختیار کرلی تھی کہ دوست دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی۔ اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔

وَمَلِيحَةٌ شَهِدَتْ بِهَا ضَرَاتُهَا
وَالْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ[1]

زینوفن لکھتا ہے:۔

"سائرس ایک نہایت دانش مند' سنجیدہ اور ساتھ ہی رحم دل فرمانروا تھا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کی شوکت وحشمت سے کہیں زیادہ اس کی مالی حوصلگی اور سیر چشمی تھی۔ اور اس کی فیاضی اور رحم دلی اپنی کوئی دوسری مثال نہیں رکھتی ۔ انسان کی خدمت اور ہمدردی اس کی شاہانہ طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زدہ انسانوں کی خبر گیری کرے مظلوموں کو ظلم سے نجات دلائے۔ درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے' غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے ساتھ عاجزی اور انکساری اس کے حسن وکمال کا سب سے بڑا زیور تھی۔ اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر' جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے۔ اور ایک ایسے خزانے کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی۔ کبھی گوارا نہیں کیا کہ فخر وغرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے"

ہیروڈوٹس لکھتا ہے:۔

"وہ ایک نہایت ہی مخیّر بادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی۔ بلکہ جود وسخاوت کا جوش تھا۔ وہ کہتا تھا سب سے بڑی دولت یہ ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے۔ اور

[1] خوبصورتی یہ ہے کہ سوکنیں بھی اس کی گواہی دیں اور فضیلت تو وہ ہے جس کی دشمن بھی شہادت دیں۔

مظلوموں کی دادرسی ہو"

ژی سیاز لکھتا ہے۔

"اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اسی فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کیلئے خوشی خوشی اپنی گردنیں کٹوادیتے"۔

سب سے زیادہ نمایاں بات جو ان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے وہ سائرس کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوا اس کی مخلوق نہیں تھا ایک بالاتر شخصیت تھی۔ جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کیلئے نمودار کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکیم نے اس کی تربیت نہیں کی۔ وقت کے متمدن ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا۔ اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چرواہا تھا۔ تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہی چرواہا جب دنیا کے سامنے آیا تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ دانش کا سب سے بڑا پیکر اور فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ ان کے سامنے تھا۔

سائرس اور سکندر:

سکندر اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا۔ اور بلاشبہ وہ بہت بڑا فاتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ اس کیلئے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا۔ اس نے انسانی حکمت کی درس گاہ کی

جگہ قدرت کی درس گاہ میں پرورش پائی تھی تاہم اس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔

سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اس کی عمر تھی۔ لیکن سائرس کی فتوحات نے جو اینٹیں چن دی تھیں، وہ دو سو برس تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اس مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ لیکن سائرس نے جب دنیا چھوڑی تو اس کی مملکت روز بروز وسیع و مستحکم ہونے والی تھی۔ اس کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند کیقباد نے اسے بھی بھر دیا۔ اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی عالمگیر سلطنت ظہور میں آگئی جو ایشیائے افریقہ اور یورپ کے اٹھائیس ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس پر سائرس کا جانشیں دارا یوش تن تنہا حکمران تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں۔ جنہیں قہر و طاقت نے سر کیا تھا۔ لیکن سائرس کی فتوحات روح و دل کی فتوحات تھیں۔ جنہیں انسانیت و فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سر اٹھاتی ہے لیکن ٹک نہیں سکتی۔ دوسری ٹک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں۔

سائرس فتح بابل کے بعد دس برس تک زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت عرب سے لے کر بحر اسود تک اور ایشیائے کوچک سے بلخ تک پھیلی ہوئی تھی اور ایشیاء کی تمام قومیں اس کے ماتحت آ چکی تھیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حادثہ بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ زینوفن کے لفظوں میں "وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا۔ بلکہ انسانوں کا شفیق مربی اور قوموں کا رحیم باپ تھا۔" [illegible] مایا سخت گیر حکمرانوں سے

بغاوت کر سکتی ہے' لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہوسکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی۔ یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر اومن ائمپائر کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے بادشاہوں کی سخت گیری' قساوت قلبی' اور ہیبت انگیز طریقہ تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سائرس کے عہد میں نہیں ملتی۔

یاد رہے کہ یہ محض قدیم یونانی مورخوں کی روایات ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے تمام محققین تاریخ کی تاریخی مسلمات ہیں۔ بالاتفاق یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت 'فرمانروائی کی عظمت اور اخلاق وانسانیت کی فضیلت جمع ہوگئی تھی۔ اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی' بی' گرنڈی **G.B.Grundy** جو موجودہ زمانہ میں تاریخ قدیم کے ایک مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب "گریٹ پرشین وار **Great Persian War** نہایت مقبول ہوچکی ہے' لکھتے ہیں:۔

"یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سائرس کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اس نے اپنی تمام معاصر قوموں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کردیا۔ اس کی ابتدائی نشوونما بالائی فارس کے

غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی۔ جس کی سرگذشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینوفن نے مدون کیں جو سقراط کا شاگرد تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کا فضائل انسانیت کا جوہر عام طور پر نمایاں ہے۔ خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں یا نہ دیں' تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کی تدبیر وسیاست کا دامن اس کی انسانیت وفضیلت کے جوہر سے بندھا ہوا تھا۔ اور جب یہ خصوصیت آشوری وبابلی شہنشاہوں کی بد عملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے۔ تو اس کی شریفانہ نمود اور زیادہ درخشندہ ہو جاتی ہے۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"یہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست انشان کا ایک گمنام رئیس تھا۔ اوراب ایشیاء کی وہ تمام مملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں' جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آچکی تھیں۔ان تمام بادشاہتوں میں جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کئے' ایک بادشاہت بھی ایسی نہ تھی جواب اپنی ہستی کا کوئی موثر ظہور رکھتی ہو۔

آکادی مملکت کے نیم اصنامی سارگون سے لے کر تبوکدرراز (بخت نصر) تک' سب کی مملکتیں اس کے آگے سربسجود ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بڑا فاتح ہی نہیں تھا' وہ ایک بڑا حکمران تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ ان دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گذرے۔ اس کی تمام وسیع مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی

نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ اس کی رعایا پر اس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہراساں ہو۔ اس کی حکومت قتل وسلب کی سزاؤں سے بالکل ناآشنا رہی۔ اب تازیانوں سے مجرموں کو نہیں پیٹا جاتا تھا' اب قتل عام کے احکام صادر نہیں ہوتے تھے۔ اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم محو کر دیئے۔ جلاوطن قومیں اپنے وطنوں میں لوٹائی گئیں۔ ان کے معبد اور معبود انہیں واپس دے دیئے گئے۔ قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جبر وتشدد باقی نہیں رہا۔ ہر قوم کے ساتھ پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ دنیا کی گذشتہ عالمگیر دہشت ناکی کی جگہ ایک عالمگیر رواداری اور عفو وبخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا۔[1]

غور کرو قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو اشارات کر دیئے ہیں۔ آج تاریخ کا داستاں سرا کس طرح اس کے ایک ایک حرف کی شرح وتفصیل سنا رہا ہے۔

(۶) اب چند لمحوں کیلئے ان تصریحات پر غور کرو جو تورات کے صحائف میں مندرج ہیں۔ کس طرح وہ سائرس کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کر رہے ہیں۔ اور کس طرح قرآن کے اشارات بھی ٹھیک ٹھیک ان کی تصدیق ہیں؟ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے کہ "خداوند کہتا ہے کہ: خورس میرا چرواہا ہے۔" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ "وہ میرا مسیح ہے۔" اور یرمیاہ نبی

---

[1] پروفیسر موصوف کے اس مقالہ کیلئے یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ کی دوسری جلد صفحہ **1085** کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جو جے اے ہمرٹن **J.A.Hammerton** نے مرتب کی ہے اور حال میں شائع ہوئی ہے۔

کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔ اب دیکھو اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہندہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟

جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر سائرس کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو بہ اول نظر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا' جس کیلئے وقت کی تمام قومیں چشم براہ ہوں۔ قوموں کا انتظار

ان کی زبانوں پر نہیں ہوتا۔ ان کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔ غور کرو۔

اس عہد کی رفتار زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ نمود تھی جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں۔صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت تک انسانی فرمانروائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاب میں رونما ہوئی تھی اور سب سے بڑا حکمران وہی سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کیلئے خوفناک ہو۔ آشور بنی پال نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس لئے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشاۃ ثانیہ میں

تبوکدرزار سب سے بڑا فاتح تھا۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں سب سے زیادہ قہرمان تھا۔ مصریوں آکادیوں' ایلامیوں 'آشوریوں اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوفناکی اور دہشت انگیزی کے مظاہر تھے۔ اور ان کی شخصیتوں نے دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہولناک استحقاق حاصل

کرلیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنو کدرزار کی شہنشاہی کا ظہور ہوا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر پیہم تین حملے کر کے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زرخیز علاقہ تاراج وویران کردیا بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہنکا کر بابل لے گیا کہ جوزیفس کے لفظوں میں ”کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت وخونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا“۔ پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کیلئے چشم براہ ہو؟ قومیں ایک نجات دہندہ کی تلاش کررہی ہوں؟ ایک ایسے نجات دہندہ کی جو انسان کے گلے کے لئے خدا کا بھیجا ہوا ”چرواہا“ ہو' جو ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بوجھ ہلکا کردے جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے دے کہ انسانی حکمرانی نوع انسانی کی خدمت کیلئے ہونی چاہیے۔ دہشت انگیزی اور خوفناکی کیلئے نہیں۔

دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں سے تنگ آچکی تھی۔ اب وہ ایک ”چرواہے“ کیلئے مضطرب تھی اور یسعیاہ نبی کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چرواہا نمودار ہوگیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں' زینوفن کے لفظوں میں ”قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کیلئے بے اختیار لپکیں۔“ کیونکہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا۔ اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے' تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوت کی اس طولانی تاریکی کے بعد صبح سعادت کی اس جہانتابی کا استقبال نہ کیا جاتا۔

غور کرو یسعیاہ نبی کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو بہو تصویر ہے کہ "وہ میرا چرواہا ہوگا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ میں اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر قوموں کو اس کے قابو میں دے دوں گا۔ اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلوا ڈالوں گا۔ میں اس کے آگے چلوں گا۔ ٹیڑھے راستے اس کیلئے سیدھے کردوں گا" سارے مورخ گواہی دے رہے ہیں کہ وہ ایک چرواہے کی طرح آیا۔ اور اس نے بندگان خدا کی رکھوالی کی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا' اس کی شقاوت ختم ہوگئی۔ وہ جس قوم کی طرف بڑھا' اس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ اس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا اس کے سارے بوجھ ہلکے ہوگئے۔ وہ صرف بنی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ تمام قوموں کا نجات دہندہ تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی میں اسے "خدا کا مسیح" بھی کہا گیا ہے۔ اور تورات کی اصطلاح میں "مسیح" وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کیلئے برگزیدہ کرلے' اور خدا کے براہ راست ممسوح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤد کی نسبت بھی آیا ہے۔ کہ "مسیح" تھے۔ سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کیلئے ایک آخری مسیح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو "مسیح" کہنا بلاشبہ اس کے تقدس اور الٰہی برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے۔

(۷) اس سلسلے میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے' وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں۔ وہ ایک خدا پرست انسان تھا۔ آخرت پر یقین رکھتا تھا۔ احکام الٰہی کے مطابق عمل

کرتا تھا۔ اوراپنی تمام کامرانیوں کو اللہ کا فضل وکرم سمجھتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا۔ لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟

یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے۔ کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور ''مسیح'' کہا اور وہ نبیوں کا موعودو منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان ہستی نہیں ہو سکتی۔ جس کا'' داہنا ہاتھ خدا نے پکڑا ہو'' اور جس کی ''ٹیڑھی راہیں وہ درست کرتا جائے'' یقیناً وہ خدا کا ناپسندیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف انہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اس کے چنے ہوئے اور اس کی ٹھہرائی ہوئی راہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

اسرائیلی نبیوں کی شہادت

آج کل کے اصحاب نقد و نظر یسعیاہ نبی کی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں کیونکہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کرلی جائے' جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے ان کی شہادتیں موجود ہیں۔ اور وہ صاف کہہ رہی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اسکا استقبال کیا تھا۔ خرقئیل اور دانیال سائرس کے معاصر تھے۔ اور دارا کے عہد تک زندہ رہے۔ ان دونوں کی تصریحات سائرس کی نسبت موجود ہیں' پھر دارا کے زمانہ میں حجی اور ذکریا کے صحیفے مرتب ہوئے اور زرکسیس (اردشیر یا ارتخششت) کے عہد میں عذرا اور نحمیاہ کا ظہور ہوا۔
ان کی سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس نبی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی۔ اور خدا نے اسے برگزیدگی کیلئے چن لیا۔

اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا' تو کیا ایک لمحہ کیلئے یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرات کرتے؟ فرض کرو' یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں ۔ اور یہودیوں ہی میں

پھیلیں۔ حتی کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں۔ پھر کیا ممکن تھا کہ بت پرست انسان کیلئے ایسی پیش گوئیاں بنائی جاسکتیں؟ کیا ممکن تھا کہ بت پرست کو اسرائیلی وحی کا ممدوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنادیا جاتا؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ کہ اجنبیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا۔ ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ اور کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی یہی عصبیت انہیں اعتراف حق سے روکتی تھی کہ "ولا تو منوآ الالمن تبع دینکم"۔ (۳:۷۳) تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جوان کیلئے ہر اعتبار سے اجنبی تھا۔ اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا بلکہ نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کرلیا۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کیلئے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی۔ اور اس کی فضیلتیں ایسی قطعی اور آشکارا تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصبیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کیلئے جو اجنبی بھی ہو' یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انہیں نجات دلائی تھی تو وہ اس کی شاہانہ عظمتوں کی مداحی کرتے' مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے کہ اس کی فضیلتیں مذہبی ہوں' ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد کا توافق موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ ہے۔ اور ممکن نہیں کہ ایک ایسے انسان کیلئے ہوا' جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے

بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟

تاریخی حیثیت سے یہ قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا پیرو تھا۔ جسے یونانیوں نے "زاردست رو" کے نام سے پکارا ہے۔ اتنا ہی نہیں' بلکہ غالبًا اسی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی۔ بلکہ قدیم مجوسی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تخم ریزی کی تھی۔ وہ ایران کی نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔

زردست کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ کا ایک مختلف فیہ موضوع بن گیا ہے۔ اور انیسویں صدی کا پورا زمانہ مختلف نظریوں اور قیاسوں کی ردوکد میں بسر ہو چکا ہے۔ بعضوں کو اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح اور گشتاسپ والا قصہ تسلیم کرلیا' بعضوں نے اس کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھادی۔ اسی طرح محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختر' بعضوں نے خراساں' بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتدا سے اکثر محققین تاریخ گلڈنر کی رائے پر متفق ہوگئے ہیں۔ اور عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا' جو سائرس کا تھا۔ اور گشتاسپ[1] والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود وہی گشتاسپ ہے۔ جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران یعنی آذربائیجان میں ہوا جسے اوستا کے حصہ "دیندی داد" میں ایریانہ دیجو" سے تعبیر کیا ہے

[1] گشتاسپ کو یونانیوں نے ہشاس پیز (Hystaspes) لکھا ہے۔

البتہ کامیابی باختر میں ہوئی۔ جس کا گورنر گشتاسپ[2] تھا۔
اس تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیے۔ اور سائرس کی تخت نشینی بالا تفاق ۵۵۰ ق۔م میں ہوئی، یعنی زردشت کی وفات کے بیس سال بعد یا عین اسی سال۔
لیکن اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا۔ تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے۔ جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے، لیکن اگر وہ تمام قرائن جمع کیے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیئے ہیں۔ تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور اس میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا، بلکہ اس کا پہلا حکمران داعی تھا۔ اور اسی نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کیلیے چھوڑا جو دو سو برس تک بلا استثناء دین زردشتی پر عمل پیرا رہے۔
اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی جن واقعات سے پڑتی ہے، وہ دو ہیں۔ اور دونوں کی تاریخی نوعیت مسلم ہے۔ پہلا واقعہ "گوماتہ" کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا کے کتبے ہیں جن سے اس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکارا ہو گئی ہے۔
سائرس کا بالاتفاق ۵۲۹ قبل مسیح میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کم بی سیز (کمبوچیہ یا کیقباد) تخت نشین ہوا۔ اس نے ۵۲۵ ق۔ م میں مصر فتح کیا۔ لیکن ابھی مصر میں ہی تھا کہ معلوم ہوا ایران میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور ایک شخص "گوماتہ" نامی اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا لڑکا سمرڈیز (فارسی: بردیہ) مشہور کر دیا ہے۔ جو بہت پہلے مر چکا تھا یا مار ڈالا گیا تھا۔

---

[2] اے دی ویمس جیکس پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کی کتاب انیشنٹ پرشیا اینڈ یز پرافٹ Ancient persia & Hisp Rophet کا مطالعہ اس باب میں کفایت کرے گا۔

یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا۔ لیکن ابھی شام میں تھا کہ ۵۲۲ قبل مسیح میں اچانک انتقال کر گیا۔ اب چونکہ سائرس کی براہ راست نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا۔ اس لئے اس کا عم زاد بھائی دارا ابن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغاوت فرو کی۔ گوماتہ کو قتل کیا۔ اور نئی مملکت کو اس کے عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ دارا کی تخت نشینی بالا تفاق ۵۲۱ قبل مسیح میں ہوئی ہے۔ پس اس کا عہد سائرس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا۔

یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغاوت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغاوت تھی اور خود دارا اپنے کتبہ بے ستون میں "گوماتہ" کو موگوش" لکھتا ہے یعنی مجوس اور مجوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے۔[1]

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغاوت "پراور تیش" نامی مجوس نے کی تھی' جسے دارا نے ہمدان میں قتل کیا۔ اور تیسری "چترِتُ خُمہ" نامی نے جواربیل میں قتل ہوا۔

دوسرا واقعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے۔ کہ دارا نے بعض بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش

---

[1] موگوش کا لفظ ایک جگہ اوستا میں آیا ہے۔ اور یہ بات اب قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے۔ کہ "گوموش" سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیرو ہیں جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رائج تھا۔ چونکہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں موگوش مشہور ہو گئے تھے۔ اس لئے عربوں میں بھی یہی نام مشہور گیا۔ اور موگوش نے مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر تمام ایرانیوں کو مجوس کہنے لگے۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اصلاً مجوسی زردشیوں کے مخالف تھے۔

کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی برباد نہ کر سکا۔ ان میں سب سے اہم کتبہ بے ستون کا ہے۔ جس میں دارا نے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنی تخت نشینی کی سرگذشت قلمبند کی ہے دوسرا استخر کا ہے۔ جس میں اپنے تمام ماتحت ممالک کے نام گنوائے ہیں۔ ان دونوں میں وہ بار بار ''اہورموزدہ'' کا نام لیتا ہے۔ اوراپنی تمام کامرانیوں کو اس کے فضل وکرم سے منسوب کرتاہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ''اہورموزدہ'' کانام لیتاہے۔ اوراپنی تمام کامرانیوں کواس کے فضل وکرم سے منسوب کرتاہے اور یہ ظاہر ہے کہ ''اہورموزدہ'' زردشت کی تعلیم کا ''اللہ'' ہے۔

ان دوواقعوں پرایک تیسرے واقعہ کا بھی اضافہ کردینا چاہیے۔ یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اس کا نہیں ملتا کہ کم بی سیز نے کوئی نیا دین قبول کیا تھا۔ یادارا کواس طرح کا کوئی معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیروڈوٹس نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی[1] ہے۔ اس لئے دارا کے عہد کے واقعات بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے۔ اور لیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہوجانے کی وجہ سے یونانیوں اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ پس سائرس کی وفات اوردارا کی تخت نشینی کے درمیان آٹھ برس کی جومدت گزری ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور وقبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔

اب غور کرو۔ ان واقعات کالازمی نتیجہ کیا نکلتاہے؟ اگر سائرس کے بعد کم بی سیزاور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی اور دارادین زردشتی پرعامل تھا۔ تو کیا اس سے ثابت نہیں ہورہا کہ دارا اور کم بی

[1] دارا کی وفات بالاتفاق ۴۸۶ قبل مسیح میں ہوئی۔ اور ہیروڈوٹس ۴۸۴ ق۔م میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد۔

سیز سے پہلے زردشتی دین خاندان میں آچکا ہے ؟اگر سائرس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیرو اس لئے بغاوت کرتے ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کرلیا گیا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے۔ کہ سائرس نیا مذہب قبول کرچکا تھا۔ اور تبدیل مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائرس کا معاصر تھا تو کیا یہ اسبات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب سے پہلے سائرس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی' اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا۔ اور نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟
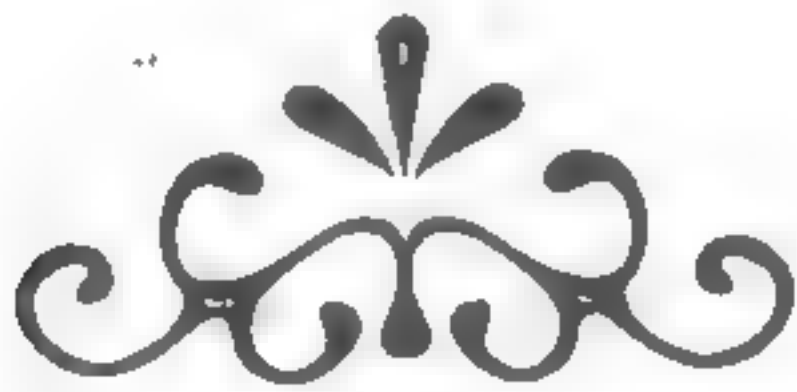
زردشت اور سائرس

اتنا ہی نہیں ' بلکہ ہم غور کرتے ہیں۔ تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے تک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی جرات نہیں کریں گے۔ اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا اور سائرس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گم نامی میں بسر ہوا۔ تو کیا اسی زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں؟ اور کیا ایسا نہیں سمجھا جاسکتا کہ اسی زمانہ میں سائرس زردشت کی تعلیم وصحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائرس کی ابتدائی زندگی کی سرگذشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے۔ پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا؟

مورخ زینوفن نے سائرس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے۔ اس افسانہ میں ایک پراسرار شخص کی پرچھائیں صاف نظر آرہی ہیں۔ جو دشت وجبل کے اس پروردۂ قدرت کو آنے والے کارناموں کیلئے تیار کر رہا تھا۔ کیا اس پرچھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمالی مغربی ایران میں ہوا تھا اور اگر سائرس کی ابتدائی گمنامی کا زمانہ بھی شمالی کوہستان میں بسر ہوا۔ تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شدہ داستان کا سراغ نہ بن جائیں؟

سائرس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور صاف نظر آرہاہے۔ کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔

بہرحال سائرس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو' یاتخت نشینی کے بعد' لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زردشتی پر عامل تھا۔

دین زردشتی کی حقیقی تعلیم:

لیکن اگرذوالقرنین دین زردشتی پرعامل تھا۔ اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کااثبات کرتاہے' اتنا ہی نہیں بلکہ اسے ملہم من اللہ قرار دیتاہے۔ توکیااس سے یہ لازم نہیں آتاکہ زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتاہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے بچنے کی ہم کوشش کریں کیونکہ یہ حقیقت اب اورپوری طرح روشنی میں آچکی ہے۔ کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خداپرستی اورنیک عملی کی تعلیم تھی۔ اور آتش پرستی اورثنویت کااعتقاداس کاپیداکیاہوااعتقاد نہیں ہے۔ بلکہ قدیم میدوی مجوسیت کارد عمل ہے۔

جس طرح روم کی مسیحیت قدیم رومی بت پرستی کے رد عمل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسی طرح زردشت کی خالص خداپرستانہ تعلیم بھی قدیم مجوسیت کے رد عمل سے بچ نہ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ ازسرنومدون ہوئی تواصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اورمیڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جوانڈویورپین آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریاؤں کی طرح ایمان کے آریوں میں بھی

پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا' پھر زمین میں آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کرلی' کیونکہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی' دونوں ظہور میں آتی تھیں۔ لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو متقابل قوتوں میں تقسیم کردیا۔ ایک قوت پاک دوسری قومی برائی کے عفریتوں کی تھی' جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحانی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی اور شیطانوں کی تاریکی میں۔ نور و ظلمت کی یہی کشمکش ہے جس سے تمام اچھے برے حوادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحانیتوں کی نمود ہے۔ اس لئے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اسی کیلئے ہونی چاہئیں۔ اسی روشنی کا مظہر آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔

اچھائی برائی کا جس قدر تصور تھا۔ وہ یونانیوں کی طرح صرف مادی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحانی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں۔ اور اس کے خاص پجاریوں کا ایک مقدس گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد "موگوش" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اسی لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کرلیا۔ لیکن زردشت نے ان تمام عقائد سے انکار کردیا۔ اس نے خدا پرستی روحانی سعادت و شقاوت اور آخرت کی زندگی کا عقیدہ پیدا کیا۔ اس نے کہا یہاں نہ تو خیر کی بہت سی روحانی ہستیاں ہیں۔ نہ شر کے بہت سے عفریت' یہاں صرف ایک "اہور موزدہ" کی ہستی ہے۔ جو یگانہ ہے' نور ہے' قدوس ہے' حق ہے' حکیم ہے' قدیر ہے' اور تمام کائنات ہستی کی خالق۔

ہے۔ کوئی ہستی نہیں جو اس کے مثل ہو' یا اس کے ہمتا ہو' یا اس کے شریک ہو۔ تم نے جن روحانی قوتوں کو خیر کا خالق سمجھ رکھا ہے۔ وہ خالق و فادار نہیں ہیں' بلکہ اہور موزدہ کے پیدا کئے ہوئے "امش سپند" ہیں یعنی ملائکہ ہیں۔ اور شر کا ذریعہ دیوتاؤں کی خوفناک قوت نہیں ہے۔ بلکہ "انزومین" (اہرمن) کی ہستی ہے۔ یعنی شیطان کی ہستی ہے۔ یہ اپنی وسوسہ اندازیوں سے انسان کو تاریکی کی طرف لے جاتی ہے۔

زردشت کی تعلیم کا عملی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ یونانیوں کی طرح اس کا اخلاقی تصور مذہب سے الگ نہیں تھا۔ بلکہ عین مذہب میں تھا۔ اس نے مذہب کو محض ایک قوم اور ملکی مذہب کی شان نہیں دی۔ بلکہ انفرادی زندگی کا روزانہ دستورالعمل بنادیا۔ نفس کی طہارت اور اعمال کی درستگی اس کی تعلیم کا اصلی محور ہے۔ انسانی زندگی کا ہر خیال' ہر قول' ہر فعل ضروری ہے' کہ اس معیار پر پورا اترے "فکر کی راستی' گفتار کی راستی اور کردار کی راستی" پرستاران اہور موز دہ کے لئے تین بنیادی اصول تھے۔ پروفیسر گرنڈی کے لفظوں میں "اس کا مذہب حقیقت اور عمل کا مذہب تھا۔ یونانی مذہب کی طرح محض رسموں اور ریتوں کا مذہب نہ تھا۔ اس نے مذہب کو ایرانیوں کی روزانہ زندگی کی ایک حقیقت بنادیا۔ اور اخلاق اس مذہب کا مرکزی عنصر تھا۔"

اس کی عبادت کا تصور ہر طرح کے اصنامی اثرات سے پاک تھا۔ عبادت ہمیں اس لئے نہیں کرنی چاہیے کہ خدا کے غضب و انتقام سے بچیں۔ بلکہ اس لئے کہ برکتیں اور سعادتیں حاصل کریں۔ اگر ہم اہور موزدہ کی عبادت نہیں کریں گے تو وہ ہمیں یونانی اور ہندوستانی دیوتاؤں کی طرح اپنے غضب کا نشانہ نہیں بنائے گا۔ لیکن خود ہم سعادت سے محروم رہ

جائیں گے۔
اس کی تعلیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو آخرت کی زندگی کا اعتقاد ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی اس دنیا میں گزرتی ہے۔ اس کے بعد بھی ایک زندگی پیش آئے گی۔ اس زندگی میں دو عالم ہوں گے۔ ایک اچھائی اور سعادت کا دوسرا برائی اور شقاوت کا۔ جن لوگوں نے اس زندگی میں نیک عمل کئے ہیں۔ وہ پہلے عالم میں جائیں گے اور جنہوں نے برے عمل کئے ہیں دوسرے عالم میں اور اس کا فیصلہ اس دن ہوگا جسے وہ ''آخری فیصلہ'' کا دن قرار دیتا ہے۔
بقائے روح کا مسئلہ اس کے مذہب کی بنیادی چٹان ہے۔ انسان فانی ہے مگر اس کی روح فانی نہیں۔ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اور ثواب وعقاب کے دو عالموں میں سے کسی عالم میں داخل ہو جاتی ہے۔
موجودہ عہد کے تمام محققین تاریخ متفق ہیں کہ زردشت کی تعلیم نے انسان کے اخلاقی اور فکری ارتقاء میں نہایت موثر حصہ لیا ہے۔ اس نے پانچ سو برس قبل مسیح ایرانیوں کو اخلاقی پاکیزگی کی ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے ان کے معاصر یونانیوں اور رومیوں کی زندگی بہت ہی پست دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسا مذہب جس کی تعلیم کا رخ سر تا سر انفرادی زندگی کی پاکیزگی کی طرف تھا اور جو اپنے پیروؤں کی اخلاقی روش کے لئے نہایت بلند مطالبے رکھتا تھا۔ ضروری تھا کہ اعمال وخصائل کے بہتر سانچے ڈھال دے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ اس نے ڈھال دئے تھے۔ یہ شہادت کن لوگوں کے قلم سے نکلی ہے ان لوگوں کے قلم سے جو کسی طرح بھی ایرانیوں کے دوست نہیں سمجھے جا سکتے۔ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا تمام زمانہ ایرانیوں اور یونانیوں کی مسلسل آویزش کا زمانہ رہا ہے۔ اور

ہیروڈوٹس اور زینوفن نے جب تاریخیں لکھی ہیں۔ تو یونان کے حریفانہ جذبات پوری طرح ابھرے ہوئے تھے۔ تاہم ' ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایرانیوں کی اخلاقی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے۔ انہیں ماننا پڑتا ہے کہ ان میں بعض ایسی عظیم فضیلتیں رکھتے تھے جو یونانیوں میں نہیں پائی جاتیں"

ہم یہاں پروفیسر گرنڈی کے الفاظ پھر مستعار لیں گے"

"ایرانی سچائی اور دیانت کی ایسی فضیلتیں رکھتے تھے۔ جو اس عہد کی قوموں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتیں"۔

ان کی راست بازی' رحم دلی' شجاعت' اور بلند نظری کا سب اعتراف کرتے ہیں' اور یہ یقیناً زردشت کی تعلیم کے لازمی نتائج تھے۔

دارا کے فرامین:

دارائے اول کا زمانہ اس مذہب کی بلند آہنگی کا شاندار زمانہ ہے۔ اس کے کتبوں میں ہمیں زردشتی تعلیم کی صدائیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔اوران سے ہم حقیقت حال معلوم کر سکتے ہیں۔ اسٹخر کا کتبہ ڈھائی ہزار برس پیشتر کی یہ منادی آج تک بلند کررہاہے۔

"خدائے بزرگ وبرتر اہورمزدہ ہے۔ اسی نے زمین پیدا کی' اسی نے آسمان بنایا' اسی نے انسان کی سعادت بنائی' اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمران اور آئین ساز بنایا"

دارا اعلان کرتا ہے کہ:

"اہورموزدہ نے اپنے فضل سے مجھے بادشاہت دی۔ اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن وامان قائم کیا۔ میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے' میرے خاندان کو' اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے۔ اے اہورموزدہ! میری دعا قبول کر"

"اے انسان! اہور موزدہ کا تیرے لئے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر۔ صراط مستقیم کو نہ چھوڑ۔ گناہ سے بچتا رہ۔"[1]

یادرہے کہ دارا سائرس کا معاصر تھا۔ اور اس کی وفات سے صرف آٹھ برس بعد تخت نشین ہوا۔ پس دارا کی صداؤں میں ہم خود سائرس کی صدائیں سن رہے ہیں۔ اس کا بار بار اپنی کامرانیوں کو اہور موزدہ کے فضل وکرم سے منسوب کرنا ٹھیک ذوالقرنین کے اس طریق خطاب کی تصدیق ہے کہ ھذا رحمة من ربی (۹۸)

لیکن چوتھی صدی قبل مسیح کے بعد زردشتی مذہب کا تنزل شروع ہوگیا۔ ایک طرف قدیم مجوسی مذہب نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ دوسری طرف خارجی اثرات بھی کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ انٹانین **(Antonine)** شہنشاہ روم کے زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائرس اور دارا کے عہد کے زردشتی مذہب نے بالکل ایک دوسری ہی شکل اختیار کرلی ہے۔ پھر سکندر اعظم کی فتوحات کا سیلاب اٹھا' اور وہ ایران کی دوصد سالہ شہنشاہی ہی نہیں بلکہ اس کا مذہب بھی بہالے گیا۔ ایرانیوں کا قومی افسانہ کہتا ہے کہ زردشت کا مقدس صحیفہ اوستا بارہ ہزار بیلوں کی مدبوغ کھالوں پر آب زر سے لکھا ہوا تھا۔ جو سکندر کے حملہ استخر میں جل کر راکھ ہوگیا۔ بارہ ہزار بیلوں کی کھال کا قصہ تو محض مبالغہ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بخت نصر کے حملہ بیت المقدس نے جو سلوک تورات کے ساتھ کیا تھا۔ وہی سکندر کے حملہ ایران نے اوستا کے ساتھ کیا۔ یعنی دونوں جگہ مذہب کا اصلی نوشتہ مفقود ہوگیا۔

پھر جب پانچ سو برس کے بعد ساسانی دور حکومت شروع ہوا۔

---

[1] اے جی۔ رالین سن **(Rawlinson)** "فائو گریٹ منا کیز آف دی انشیٹ ایسٹرن ورلڈ"

تومذہب زردشت کی از سرنو تدوین کی گئی۔ اور جس طرح قید بابل کے بعد عزرا نے نئی تورات مرتب کی تھی۔ اسی طرح اردشیر بابکانی نے از سر نواوستاکا نسخہ مرتب کرایا۔ لیکن اب مذہب کی تمام حقیقی خصوصیات طرح طرح کی تبدیلیوں' تحریفوں' اور اضافوں سے یک قلم منسوخ ہوچکی تھیں۔ چنانچہ صاف دکھائی دیتاہے کہ ساسانی عہد کا مذہب قدیم مجوسیت 'زردشتیت اوریونانیت کاایک مخلوط مرکب ہے۔ اوراس کا بیرونی رنگ روغن توتمام ترمجوسیت ہی نے فراہم کیا ہے۔ اسی ساسانی اوستا کا ایک ناقص اور محرف ٹکڑا ہے۔ جو ہندوستان کے پارسیوں کے ذریعے ہم تک پہنچاہے' اور جس کیلئے ہم ایک فرنچ مستشرق آنک تیل کی الوالعزمیوں اور علمی قربانیوں کے شکرگزار ہیں۔

اہور موزدہ کی مزعومہ شبیہہ:

اس سلسلہ میں ایک بحث طلب سوال اور ہے ۔اور ضروری ہے کہ اس پر بھی نظرڈالی جائے۔ یہ مسلم ہے کہ پیروان زردشت میں بت پرستی کی کوئی شکل بھی سر نہ اٹھاسکی۔ قدیم مجوسی مذہب میں بھی اس کاکوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن ایران میں دارا اور اس کے بعد کے عہد کے جو آثار ملے ہیں۔ ان میں ایک خاص صورت کا نقش پایاجاتاہے۔ یہ بادشاہ کی تصویر نہیں ہوسکتی' کیونکہ بادشاہ کی شخصیت مرقع میں الگ نمایاں ہے۔ اس کا محل ہر جگہ بلندی میں اور سب سے اوپر واقع ہوا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ خودبادشاہ سے بھی ایک بلند ترہستی ہو۔ سوال یہ پیدا ہواکہ یہ کون سی ہستی ہے۔ ؟سب سے پہلے یہ صورت بے ستون کے مرقع میں زیربحث ہوئی۔ جب ۱۸۴۷ء میں کرنیل رالین سن سے اپنی شرح وحل کے ساتھ اصل مرقع کا چربہ شائع کیا۔ پھر بھی صورت متعدد نقوش میں ملی مثلاً دارا

کی سرکاری مہر کے مرقع میں۔ نقش رستم میں جو دراصل دارا کی قبر ہے۔ استخر کے محل شاہی کے دروازہ پر جو غالبً درمیانی دروازہ ہے۔ رالین سن نے پہلے سر رابرٹ کیر پورٹر نے یہ نظریہ قائم کرلیا تھا کہ یہ کوئی مافوق انسانیت ہستی ہونی چاہیے جو خود بادشاہ سے بھی اوپر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ رالین سن ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ یہ اہور موزدہ کی ہستی ہے 'یعنی خدا کی' چنانچہ اس وقت سے یہ رائے برابر مقبول ہوتی گئی۔ اب عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے' کہ ایرانی اگرچہ بت پرستی سے مجتنب رہے۔ لیکن انہوں نے اہور موزدہ کی ہستی کے لئے ایک مرموز یعنی (symbolic) تشخص کا تصور ضرور قائم کر لیا تھا جو ان تصویروں میں نمایاں ہے۔ اور یہ مصریوں اور آشوریوں کے مرموز تجسم کا اثر تھا جس سے وہ بھی متاثر ہو گئے[1]

لیکن ۱۹۱۲ء عیسوی سے (جب کہ میں نے پہلے پہل ایرانی آثار قدیمہ کا بغور مطالعہ کیا) میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ قیاس اول دن سے غلط رخ پر چلا ہے اور تمام تاریخی اور عقلی قرائن اس کے خلاف ہیں۔

اولاً تمام تاریخی شہادتیں اور خود پارسیوں کا مسلسل تعامل ثابت کررہا ہے کہ انہوں نے الوہیت کا تصور کبھی کسی انسانی جسم وصورت میں نہیں کیا۔ اور کبھی کسی مجسمہ کو تقدیس کی نظر سے نہیں دیکھا۔

ثانیاً اگر امتداد زمانہ سے یہ چیز پیدا بھی ہوگئی ہو۔ جب بھی کسی

[1] عام رائے یہی ہوگئی ہے۔ لیکن ایسی صدائیں برابر اٹھتی رہتی ہیں۔ جنہیں اس رائے سے اختلاف ہوا' کرنیل رالین سن کی اشاعات سے چند سال بعد لغات شرقیہ کے ایک عالم ریورینڈ رچارلس فارسٹر (forster) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ تصویر اس نقاش کی ہے جس نے مرقع نقش کیا تھا۔ اور جو حلقہ اسکی کمر کے گرد نظر آرہا ہے یہ معماروں کی ٹوکری ہے۔ جس میں بیٹھ کر بلندی پر کام کیا کرتے تھے۔ (دیکھو مصنف مذکور کی کتاب (one primevallangodge) جلد سوم صفحہ 179)

طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ خود دارا کے عہد میں پیدا ہو گئی ہو۔ جو زردشت کی تعلیم کا ابتدائی عہد تھا۔ اور جب یونانی مورخوں کی شہادت کے مطابق 'ایرانی' یونانی بت پرستی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

ثالثاً اس شبیہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو معبودیت والوہیت کی کوئی خاص شان رکھتی ہو۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی صورت اور وضع ہے۔ اور وہ ایک معمولی انسان کی ہے' جس نے اس زمانے کا عام لباس پہن رکھا ہے اور وہی لباس جو خود دارا اور اس کے جانشینوں کا تصویروں میں دکھایا گیا ہے۔ صرف اتنی بات اس میں زیادہ ہے کہ ایک حلقہ اس کی کمر سے نیچے چاروں طرف بنا دیا گیا ہے۔ اور عقب میں ایک ایسا طولانی نقش ہے۔ جس میں لہروں کی سی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس حلقہ اور لہروں کو سورج کی مرموز شکل قرار دیا گیا ہے۔ اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے' جب بھی اس کیلئے کافی نہیں کہ محض یہ مشتبہ حلقہ اور مشتبہ لہریں ایک خالق ہستی کے تصور کے لئے پیروان زردشت کا منتہائے خیال تھا۔

رابعاً اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ اس حلقہ اور لہروں میں ایک ماورائے انسانیت ہستی کا تصور مرکوز تھا' جب بھی یہ اہورموزدہ کی ہستی کیوں ہو۔ جس کی نسبت زردشت نے تقدیس وعلو کا اس درجہ بلند تصور قائم کیا ہے۔ کیوں یہ کسی ایسے انسان کی صورت نہ ہو جو اگرچہ انسان تھا مگر اپنی انسانیت کی رفعت وتقدیس کی وجہ سے ایک غیر معمولی ہستی سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً خدا کی ایک فرستادہ ہستی۔

بہر حال اس رخ پر ہم جس قدر بڑھتے ہیں یہ بات واضح ہوتی جاتی ہے کہ اسے اہورموزدہ کی ہستی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ یہ یا تو خود زردشت کی تصویر ہے جو ایرانی مذہب کا بانی تھا۔ یا سائرس کی ہے جو اس

مذہب کا حکمران پیغمبر اور ہنخانشی شہنشاہی کا پہلا تاجدار تھا۔
چونکہ اس صورت کے بائیں ہاتھ میں ہر جگہ ایک حلقہ دکھایا گیا ہے اور قدیم تصورات میں حلقہ کی شکل حکومت ومالکیت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے زیادہ قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سائرس کی تصویر ہو۔[1]

[1] ۱۹۱۳ء میں میں نے اپنا یہ خیال مسٹر ڈوڈبراون پروفیسر کیمرج یونیورسٹی ومصنف لٹریری ہسٹری آف پرشیا وغیرہ Mr. Edward brown professor cambridge university and author literary history of persia کو لکھا تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا تھا۔ اور بہت اصرار کے ساتھ لکھا کہ بعض مستشرقین جرمنی سے اس بارے میں مراسلت کروں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے لکھا۔ وہ خود اس بارے میں خط وکتابت کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ اور میری خط وکتاب کا سلسلہ سنسر کی سخت گیریوں نے بالکل مسدود کر دیا۔ پھر میں نظربند ہوگیا۔ اور جب چھوٹا تو اس کے چند دنوں بعد ان کے انتقال کی خبر آگئی۔

○○○

کیا ذوالقرنین نبی تھا؟

جہاں تک قرآن کی تصریحات کا تعلق ہے۔ ایک اہم سوال اور باقی رہ گیا ہے۔ قرآن میں ہے۔"قُلْنَا یٰذَاالْقَرْنَیْنِ"ہم نے کہا اے ذوالقرنین اس خطاب کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین براہ راست وحی الٰہی سے مخاطب تھا؟ مفسرین نے اس پر طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اور چونکہ امام رازی سکندر مقدونی کو ذوالقرنین بنانا چاہتے ہیں اور وہ بنتا نہیں۔اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں قُلْنَا کے منطوق پر اس کے مفہوم کو ترجیح دیں۔

اس میں شک نہیں کہ قُلْنَا کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بالواسطہ خطاب ہو۔ یعنی اس عہد کے کسی پیغمبر کے ذریعہ ذوالقرنین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ جیسا کہ "فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا"(۳:۲) میں ہے۔ یا خطاب قولی نہ ہو۔ تکوینی ہو، جیسا کہ "قِیْلَ یٰاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ"(۴۴:۱۱)قُلْنَا یٰا نَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ" (۶۹:۲۱) وغیرہا آیات میں ہے لیکن اس طرح کا مطلب جب ہی قرار دینا چاہیے کہ اس کے لئے قوی وجوہ موجود ہوں اور یہاں کوئی وجہ موجود نہیں۔ آیت کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ نے براہ راست مخاطب کیا اور اس پر اللہ کی وحی نازل ہوئی تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ یہ وحی نبوت کی وحی تھی یا اس طرح کی وہی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی

والدہ کی نسبت بیان کی گئی ہے۔"وَاَوحَینَا اِلیٰ اُمِّ مُوسیٰ اَنْ اَرْضِعِیہِ"(۷:۲۸)توصحابہ سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا۔ اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن کثیر بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

اور غور کرو' قرآن کا یہ بیان سائرس کی شخصیت پر کس طرح' ٹھیک ٹھیک منطبق ہورہا ہے؟ تاریخ اس کی پیغمبرانہ شخصیت کی شہادت دے رہی ہے۔ اور عہد عتیق کے انبیاء اسے صریح خدا کا برگزیدہ 'اس کا مسیح اور اس کی مرضی پورا کرنے والا کہہ رہے ہیں۔ عزرا نبی کی کتاب میں اس کا جو فرمان تعمیر بیت المقدس کیلئے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں وہ خود اعلان کرتا ہے۔ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیا کے ملک میں اس کی عبادت کیلئے ایک ہیکل تعمیر کروں" اس کا یہ کہنا کہ "خدا نے مجھے حکم دیا ہے" ٹھیک ٹھیک قُلْنَا یا ذَالْقَرْنَیْنِ کی تصدیق ہے۔ ہم اس سے پہلے خدااس کی پرستی کے اثبات میں جو کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس میں سے ہر بات ٹھیک ٹھیک اس کی نبوت کے ثبوت میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

اب صرف ایک معاملہ کی تشریح باقی رہ گئی ہے۔ یعنی یاجوج اور ماجوج سے کون سی قوم مراد ہے؟ اور جو سد سائرس نے بنائی تھی اس کی تاریخی نوعیت کیا ہے؟
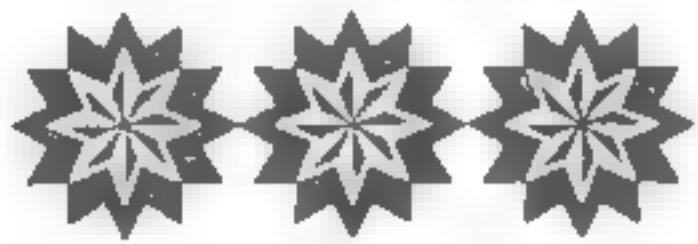
یاجوج ماجوج (قیامت کی نشانی)

ابوسریحہ حذیفہ بن اسیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بالا خانے میں تشریف فرما تھے اور ہم نیچے بیٹھے تھے آپ ﷺ نے ہمیں جھانکا اور فرمایا تم کیا ذکر کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کیا قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا لا تکون حتی تکون عشر ایات جب تک دس نشانیاں (ظاہر) نہ ہوں گی قیامت برپا نہیں ہو گی۔

(۱) خسف بالمشرق = مشرق میں زمین کا دھنسنا۔

(۲) و خسف بالمغرب = مغرب میں زمین کا دھنسنا۔

(۳) و خسف فی جزیرة = جذیرہ عرب میں زمین کا دھنسنا۔

(۴) والدخان = اور دھواں۔

(۵) والدجال = اور دجال۔

(۶) ودآبته الارض = اور زمین کا جانور۔

(۷) و یاجوج وما جوج = اور یاجوج و ماجوج۔

(۸) وطلوع الشمس من مغربها = مغرب سے آفتاب کا نکلنا۔

(۹) ونار تخرج من قعرعدن ترحل الناس = ایک آگ جو عدن کے کنارے سے نکلے گی اور لوگوں کو ہانک لے جائے گی۔ (صحیح مسلم)

(۱۰) نزول عیسی ابن مریم علیه السلام = عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نازل ہونا۔ (یہ دسویں نشانی دوسری روایت میں ہے)

یاجوج ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے دو قبیلوں کے نام ہیں۔ بڑے ظالم، خونخوار اور درندوں کی طرح ہیں۔ ان کا ملک

قطب شمال کی سمت ایک ایسے مقام پر ہے جہاں دو بہت اونچے پہاڑ ہیں- دوسرے پہاڑوں کی طرح ان پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں اور دونوں پہاڑ سمندر کے کنارے پر ہیں- صرف جنوب کی طرف تھوڑا سا راستہ ہے وہاں ذوالقرنین نے اللہ کے حکم سے لوہے کی بہت بڑی دیوار بنا دی ہے یہ دیوار ۶۰ گز چوڑی اور پہاڑوں کے برابر بلند ہے- یاجوج ماجوج ان پہاڑوں اور آہنی دیوار کے اندر محصور ہیں- وہ اس دیوار کو توڑتے پھوڑتے اور چاٹتے رہتے ہیں تاکہ وہاں سے نکل سکیں- قیامت کے قریب جب اللہ چاہے گا وہ اس دیوار کو توڑ کر مکڑی کی طرح زمین پر پھیل جائیں گے- تباہی و بربادی کی آندھی بن کر ہر چیز کو روندتے ہوئے بیت المقدس کے پہاڑ تک پہنچ جائیں گے- جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:-

حتے اذا فتحت یاجوج و ماجوج و هم من كل حدب ینسلون (الانبیاء۹۶)

"یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج (سد ذوالقرنین کی قید سے) کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے ڈھلکتے ہوئے چلے آئیں گے"-

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک محفوظ جگہ میں چلے جائیں گے اور یاجوج ماجوج کے عذاب سے نجات کی دعائیں مانگیں گے- پھر اللہ کے حکم سے ان پر وبا آئے گی اوریاجوج ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا ہو جائے گا جس کے باعث صبح تک سب مر جائیں گے- زمین پر بالشت بھر جگہ ان کی لاشوں سے خالی نہ رہے گی ان کی لاشوں کی گندگی اور سڑاند سے دماغ پھٹے گا- پھر عیسیٰ علیہ اسلام دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کچھ پرندے بھیجے گا جو ان کی لاشوں کو اٹھا کر لے جائیں گے- پھر اللہ تعالیٰ کی بارش برسائے گا اور زمین آئینہ کی طرح صاف ہو جائے گی- (یہ تمام تفصیل کتب احادیث سے ماخوذ ہے ..... طارق)

یاجوج ماجوج

قرآن مجید نے یاجوج اور ماجوج کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک تو یہاں ہے دوسرا سورہ انبیاء میں ہے: "حَتّٰی اِذَافُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَ مَاجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ" (۹۶:۲۱)

یاجوج اور ماجوج کا نام سب سے پہلے عہد عتیق میں آیا ہے۔ حزقیل نبی کی کتاب میں' جنہیں بخت نصر اپنے آخری حملہ بیت المقدس میں گرفتار کر کے بابل لے گیا تھا اور جو سائرس کے ظہور تک زندہ رہے' یہ پیشن گوئی ملتی ہے۔

"اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اس نے کہا۔ اے آدم زاد تو جوج کی طرف اپنا منہ کر کے اس کے برخلاف نبوت کر' جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے۔ اور روس' مسک اور توبال کا سردار ہے۔ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ میں تیرا مخالف ہوں' میں تجھے پھرا دوں گا۔ تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا۔ تیرے سارے لشکر اور گھوڑوں اور سواروں کو جو جنگی پوشاک پہنے چوپہریاں اور سپر لئے ہوئے ہیں اور سب شمشیر بکف ہیں' کھینچ نکالوں گا۔ اور میں اس کے ساتھ فارس کوش اور فوط کو بھی کھینچ نکالوں گا۔ جو سپر لئے ہوئے اور خود پہنے ہوں گے۔ نیز جومر اور شمال بعید کے اطراف کے باشندگان تجرمہ اور ان کا سارا لشکر"

اس کے بعد دور تک تفصیلات چلی گئی ہیں' اور چار باتیں خصوصیت کے ساتھ کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جوج شمال کی طرف سے آئے گا' تاکہ لوٹ مار کرے۔ دوسری یہ کہ "ماجوج پر اوران پر جو جزیروں میں سکونت رکھتے ہیں۔ تباہی آئے گی"۔

تیسری یہ کہ جولوگ اسرائیل کے شہروں میں بسنے والے ہیں۔ وہ بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے۔ اوران کے بے شمار ہتھیاران کے ہاتھ آئیں گے۔

چوتھی یہ کہ ماجوج کی تباہی کا گورستان "مسافروں کی وادی" میں بنے گا۔ جو سمندر کے پورب میں ہے"۔ان کی لاشیں عرصہ تک وہاں پڑی رہیں گی۔ لوگ انہیں گاڑتے رہیں گے' تاکہ رہ گزر صاف ہو جائے۔ (باب ۳۹:۳۸)

یہ واضح رہے کہ اس پیشین گوئی سے پہلے سائرس کے ظہور اور یہودیوں کی آزادی وخوش حالی کی پیشین گوئی بیان کی جاچکی ہے۔ اوراس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے' جس میں خزقیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا۔ اور جسے قرآن نے بھی سورۂ بقرہ کی آیت "اوکالذی مرعلی قریة وھی خاویة علی عروشھا (۲:۲۵۹) میں بیان کیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ جوج اور ماجوج کا معاملہ بھی اسی زمانہ کے لگ بھگ پیش آنے والا ہو۔ یعنی سائرس کے زمانہ میں اور یہ سائرس کے ذوالقرنین ہونے کا ایک مزید ثبوت ہے۔ کیونکہ قرآن صاف کہہ رہاہے کہ اسی نے یاجوج اور ماجوج کے حملوں کی روک تھام کیلئے ایک سد تعمیر کی تھی۔ عہد عتیق کے بعد یہ نام ہمیں مکاشفات یوحنا میں بھی ملتاہے۔ جس میں بیان کیاگیاہے کہ:۔

"جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے۔ تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہوں گی۔ یعنی یاجوج اور ماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑانے کیلئے جمع کرنے نکلے گا۔ ان کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا۔ وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائے گا۔ (۲۰:۷)

گاگ اور مے گاگ:

یاجوج اورماجوج کیلئے یورپ کی زبانوں میں GOGاور MAGOGنام مشہور ہوگئے ہیں۔ اور شارحین تورات کہتے ہیں کہ یہ نام سب سے پہلے تورات کے ترجمہ سبعینی[1] میں اختیار کئے گئے تھے۔ لیکن کیا اس لئے اختیار کئے گئے تھے کہ جوج اور ماجوج کا یونانی تلفظ یہی ہو سکتا تھا یا خود یونانی میں پہلے سے یہ نام موجود تھے؟ اس بارے میں شارحین کی راہیں مختلف ہیں۔ لیکن زیادہ قوی بات یہی معلوم ہوتی ہی کہ یہ دونوں نام اسی طرح یا اس کے قریب قریب یونانیوں میں بھی مشہور تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کون قوم تھی؟ تمام تاریخی قرائن متفق طور پر شہادت دے رہے ہیں۔ کہ اس سے مقصود صرف ایک ہی قوم ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔

یعنی شمال مشرقی میدانوں کے وہ وحشی مگر طاقت ور قبائل جن کا سیلاب قبل از تاریخ عہد سے لے کر نویں صدی مسیحی تک برابر مغرب کی طرف امنڈتا رہا۔ جن کے مشرقی حملوں کی روک تھام کیلئے چینیوں کو سینکڑوں میل لمبی دیوار بنانی پڑی تھی۔ جن کی مختلف شاخیں تاریخ

[1] ترجمہ سبعینی سے مقصود تورات کا وہ پہلا یونانی ترجمہ ہے جو اسکندریہ میں شاہی حکم سے ہوا تھا۔ اور جس میں ستر علمائے یہود شریک تھے۔

میں مختلف ناموں سے پکاری گئی ہیں اور جن کا آخری قبیلہ یورپ میں میگو کے نام سے روشناس ہوا۔ اور ایشیاء میں تار تاریوں کے نام سے اسی قوم کی ایک شاخ تھی۔ جسے یونانیوں نے سیتھین Seythian کے نام سے پکارا ہے۔ اور اسی کے حملوں کی روک تھام کے لئے سائرس نے سد تعمیر کی تھی۔

منگولیا:

شمال مشرق کے اس علاقہ کا بڑا حصہ اب "منگولیا" کہلاتا ہے۔ لیکن "منگول" لفظ کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس کے لئے جب ہم چین کے تاریخی مصادر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (اور ہمیں اسی طرف رجوع ہونا چاہیے کیونکہ وہ منگولیا کے ہمسایہ میں ہے) تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم نام "موگ" تھا۔ یقیناً یہی "موگ" ہے جو چھ سو برس قبل مسیح یونانیوں میں "میگ" اور "مے گاگ" پکارا جاتا ہوگا۔ اور یہی عبرانی میں "ماجوج" ہو گیا۔

چین کی تاریخ میں ہمیں اس علاقہ کے ایک اور قبیلہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو "یواچی" Yueh- Chi کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہی یواچی ہے جس نے مختلف قوموں کے مخارج و تلفظ سے گذر کر کوئی ایسی شکل اختیار کرلی تھی کہ عبرانی میں "یاجوج" ہو گیا۔

اس امر کی وضاحت کیلئے ضروری ہے کہ ان نتائج پر ایک اجمالی نظر ڈال لی جائے۔ جو مختلف قوموں کے نسلی جغرافیائی اور لغوی علایق کی بحث وتنقیب سے پیدا ہوئے ہیں اور جو موجودہ زمانے میں تاریخ اقوام کے طے شدہ مبادیات ہیں۔

کرۂ ارض کی بلند سطح کا وہ حصہ جو شمال مشرق میں واقع ہے۔

اور جسے آج کل منگولیا اور چینی ترکستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم کی بے شمار قوموں کا ابتدائی گہوارہ رہ چکا ہے۔ یہ نسل انسانی کا ایک ایسا سرچشمہ تھا جہاں پانی برابر ابلتا اور جمع ہوتا رہتا۔ اور جب بہت بڑھ جاتا تو مشرق و مغرب کی طرف امنڈنا چاہتا۔ اس کے مشرق میں چین تھا۔ مغرب وجنوب میں مغربی اور جنوبی ایشیاء اور شمالی مغرب میں یورپ چنانچہ یکے بعد دیگرے قوموں اور قبیلوں کے سیلاب امنڈتے رہے۔ کچھ وسطی ایشیاء میں آباد ہوگئے۔ کچھ آگے بڑھے اور شمالی یورپ تک پہنچ گئے۔ کچھ وسط ایشیاء سے نیچے اتر گئے اور جنوبی و مغربی ایشیا پر قابض ہوگئے۔ یہ قبائل جو اس علاقہ سے نکلتے تھے۔ مختلف ملکوں میں بس کر وہاں کی خصوصیات اختیار کر لیتے تھے۔ اور رفتہ رفتہ ایک مقامی قوم بن جاتے تھے۔ لیکن ان کا وطنی سرچشمہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہتا۔ یہاں تک کہ پھر قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا اور کسی نئے علاقے میں پہنچ کر نئی مقامی قومیت کی تخلیق کر دیتا۔

یہ علاقہ صدیوں تک اپنی اصلی وحشیانہ حالت پر باقی رہا۔ لیکن جو قبائل یہاں سے نکل کر مختلف ملکوں میں بستے گئے۔ انہوں نے مقامی خصوصیات اختیار کر کے تہذیب و تمدن کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد ان کی حالت اس درجہ مختلف ہوگئی کہ ان میں اور ان کے قدیم ہم وطنوں میں کوئی بات بھی مشترک یا باقی نہیں رہی۔ وہ اب مہذب ہو رہے ہیں۔ یہ بدستور وحشی تھے' وہ تہذیب کے صنائع ہتھیاروں سے لڑتے تھے یہ وحشت کی قدرتی ہمجیت اور درندگی ہے۔ ان میں زراعت 'صناعت اور ذہنی ترقی کی مختلف شاخیں ابھر رہی تھیں۔ وہ ان سب سے ناآشنا تھے۔ سرد علاقہ کی صحرائی زندگی اور وحشیانہ خصائل کی خشونت نے انہیں وقت کی شائستہ اقوام کیلئے ایک خوفناک ہستی بنادیا تھا۔

قبل اس کے کہ تاریخی عہد صبح طلوع ہو' شمال مغربی قبائل کی یہ مہاجرت شروع ہو چکی تھی۔ اور اسکا سلسلہ تاریخی عہد میں بھی بدستور جاری رہا۔

ان ہی قبائل کا ایک ابتدائی گروہ وہ تھا جو آرین نسل کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ وسط ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھ گیا ہے۔ ایک نیچے اتر کر پنجاب میں آباد ہو گیا۔ ایک مغرب کی طرف بڑھا اور فارس اور میڈیا اور اناتولیا میں بس گیا۔

اسے اب انڈویورپین آریا کے نام سے شناخت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان اور یورپ دونوں کی آریائی اقوام کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان کا جو حصہ شمالی ہند میں بس گیا تھا۔ اس نے اپنا نسلی خطاب برابر یاد رکھا اور اپنے کو آریا ورتھ کہتا رہا۔ جو فارس اور میڈیا میں بسا اس نے اپنی ابتدائی قیام گاہ کو ایریانہ کے نام سے موسوم کیا۔ (جسے اوستا میں ایریانہ ویگو کہا گیا ہے۔) اور یہی ایریانہ ایران ہو گیا۔ جو قبائل اناتونیا تک پہنچ گئے تھے،وہ غالب ہٹی **Hititie** کے نام سے پکارے گئے۔ جنہیں تورات کی کتاب پیدائش میں "حتی" کہا گیا ہے اور مصر کے قدیم نوشتوں میں "ختتی پایا جاتا ہے۔"

جو قبائل یورپ میں پہنچے۔ وہ گوتھ 'فرانک 'الامان اونڈال ٹیوٹان اور ہن کے نام سے مشہور ہوئے۔ اوران ہی کی ایک وسیع شاخ وہ تھی جو بحر اسود سے لے کر دریا ڈینوب کی بالائی وادی تک پھیل گئی اور سیتھین کے نام سے پکاری گئی۔ وسط ایشیا کے مشرقی قبائل بھی جو بکڑیا(بلخ) پر تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔ سیتھین ہی تسلیم کئے گئے ہیں۔ اور خود دارا نے اپنے کتبہ اسخر میں انہیں اسی نام سے پکارا ہے۔

ان قبائل کی جو تین شاخیں شمالی ہند،اناتولیہ(ایشیائے کوچک)

اورایران میں بس گئی تھیں۔ انہیں ایسا ماحول ملاجو زراعت کیلئے موزوں تھا۔ اس لئے بہت جلدانہوں نے زراعتی زندگی اختیار کرلی اور پھر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھنے لگیں۔ لیکن جو شاخیں یورپ کی طرف بڑھیں۔ انہیں ایساماحول میسر نہیں آیا۔ اس لئے صحرائی زندگی کی تمام خصوصیات ان میں بدستور باقی رہیں۔ اور صدیوں تک متغیر نہ ہوئیں۔ اب گویا ان قبائل کی تین حالتیں ہوگئی تھیں۔

اولا منگولیا کے اصلی باشندے جو یک قلم وحشی اور صحرائی تھے۔ اوران کی یہ حالت بغیر کسی تغیر کے برابر قائم رہی۔

ثانیا بحر اسود کے شمالی ساحل اور شمالی یورپ کے قبائل جو گو اپنے مولا اصلی سے الگ ہوگئے تھے لیکن ان کی وحشیانہ خصوصیات نہیں بدلی تھیں۔

ثالثا ہندوستان 'ایران' اناتولیا کے قبل جو بتدریج شہریت وحضارت میں ترقی کرنے لگے ۔ اورپھر آگے چل کر تین قدیم تہذیبوں کے بانی ہوئے۔

یاجوج ماجوج کااطلاق:

تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح سے لے پانچویں صدی مسیحی تک یاجوج اور ماجوج یاگواگ اور ے گگ کااطلاق پہلی دو قسموں پر ہوتا رہا۔ پہلی پر اس لئے کہ قومیت اور مقام کے لحاظ سے وہی یاجوج وماجوج تھی۔

دوسری پراس لئے کہ گو اپنے مولا ومقام سے الگ ہوچکی تھی، لیکن اپنی وحشیانہ خصوصیات میں بالکل متغیر نہیں ہوئی تھی۔

تیسری قسم چونکہ یک قلم منقلب ہوچکی تھی۔اس لیے اب وہ یاجوج ماجوج نہیں رہی تھی۔ بلکہ خود یاجوج کی غارت گریوں کانشانہ بن گئی

تھی۔ البتہ جب پانچویں صدی مسیحی میں یورپ کے قبائل کی حالت بھی منقلب ہونا شروع ہو گئی اور مسیحیت اختیار کر کے تہذیب وحضارت کی طرف بڑھنے لگے۔ تو قوموں کے حافظہ سے ان کا نام بھی بھی اتر گیا۔ اور یاجوج وماجوج کا اطلاع صرف اسی خطہ میں سمٹ آیا۔ جہاں سے پھیلنا شروع ہوا تھا۔ یعنی صرف منگولیا کے صحرانورد قبائل ہی یاجوج' وماجوج سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ قرآن نے سورۃ انبیاء میں ان کے جس خروج کی خبردی ہے وہ منگولیا کے تاتاریوں کا آخری خروج تھا۔

یورپ کی تمام موجودہ قومیں (لاطینی نسل مستثنیٰ کردینے کے بعد) براہ راست ان ہی قبائل کی نسل سے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ومسلم ہے۔

اس موقع پر یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ نسل انسانی نے اکثر حالتوں میں پہلے صحرانوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے۔ پھر توطن اوراقامت گزینی' قبائل کے گروہ معیشت کی یہ دونوں حالتیں اس درجہ مختلف تھیں کہ ایک ہی نسل کے دو قبیلوں میں سے ایک قبیلہ اگر صحرانورد رہتا تھا اور دوسرا اقامت گزیں ہو جاتا تھا۔ تو چند صدیوں کے بعد نہ صرف ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے تھے۔ بلکہ بالکل متضاد قسم کی مخلوق بن جاتے تھے صحرانورد قبائل کو غذا کیلئے جانوروں کے دودھ اور شکار کے گوشت پر اعتماد کرنا پڑتا تھا' اقامت گزیں قبائل کو اناج پر۔ وہ گھوڑوں کی برہنہ پیٹھ پر زندگی بسر کرتے' یہ کھیتوں میں اور مکانوں کی چاردیواری میں۔ ان کی زندگی کا ماحول صحرائیت تھی، اور ان کا ماحول شہریت 'ان کو نشوونما کیلئے جنگ کی ضرورت تھی' ان کو امن کی۔ ان کا جسم روز بروز طاقت ور اور محنت پسند ہوتا جاتا تھا۔ ان کا روز بروز کمزور اور راحت پسند' وہ روز بروز وحشت وخونخواری میں بڑھتے جاتے تھے۔ یہ روز بروز تہذیب وحضارت

میں۔ تہذیب وحضارت کالازمی نتیجہ تھا کہ جذبات وخصائل میں لطافت اور نرمی پیداہو۔ صحرایت وخانہ بدوشی کالازمی نتیجہ تھا، کہ جذبات تند اور خصائل میں وحشت وخشونت ہو۔ نتیجہ یہ نکلتاکہ جوں جوں اقامت گزیں قبائل شائستہ ہوتے جاتے۔ صحرانوردقبائل کی ہستی ان کیلئے ہولناک اورناقابل مزاحمت ہوتی جاتی۔ جب کبھی دونوں میں مقابلہ ہوتا توشہری قبائل دیکھتے کہ صحرانوردقبائل عفریتوں کی طرح خوفناک اور درندوں کی طرف خونخوار ہیں۔ اورصحرانوردقبائل معلوم کرلیتے کہ ان کی غارت گریوں کے لئے شہری آبادیوں سے زیادہ کوئی سہل شکار نہیں۔

البتہ صحرانورد قبائل متفرق تھے اور اقامت گزینی کے طریقوں سے ناآشنا۔اقامت گزیں قبائل باہم مربوط تھے اورمعیشت کے منظم طریقوں سے آشنا۔ اس لئے قدرتی طور پر صحرانوردوں کے حملے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ وہ خوفناک درندوں کی طرح آبادیوں پرگرتے اور قتل وغارت کرکے نکل جاتے۔ لیکن جم کرٹک نہیں سکتے تھے۔ اورنہ علاقے فتح کرسکتے تھے۔ مگر جب کبھی صدیوں کے بعدان میں کوئی حکمران قائد پیداہوجاتا،اوروہ بہت سے قبیلوں کو متحد کرکے ایک فوج کی نوعیت دے دیتا۔ تو پھر قتل وغارت گری کی ایک ایسی منظم طاقت پیدا ہو جاتی۔ جوصرف وقتی حملوں ہی پر قانع نہیں رہتی۔ بلکہ مملکتوں اورقوموں پر قابض ہوجاتی اور شہری آبادیوں کی بڑی سے بڑی قومیں بھی اس کی راہ نہیں روک سکتیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ صحرانورد اورغیر متمدن اقوام کے مقابلہ میں شہری اور متمدن اقوام کاہمیشہ ایسا ہی حال رہا۔ یہاں تک کہ علم وصناعت نے ایسے ہتھیار اور جنگی وسائل پیداکردیئے جن کے مقابلہ سے غیر متمدن

اقوام عاجز آگئیں۔

چنانچہ ان شمالی مشرقی قبائل کی پوری تاریخ اسی حقیقت کا افسانہ ہے۔ ان کی جن شاخوں نے اقامت گزینی کی زندگی اختیار کرلی تھی' وہ بالکل ایک دوسری قوم بن گئی۔ اور جنہیں ایسے حالات میسر نہیں آئے۔ وہ بدستور صحرانورد ہیں۔ اقامت گزین قبائل کیلئے صحرانورد کے قبائل صرف اجنبی ہی نہیں تھے بلکہ خوفناک بھی ہوگئے تھے۔ کیونکہ ان کی روزافزوں شہریت ان کی صحرائی وحشت ناکیوں کامقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ یہ جب بھی موقع پاتے' قریب وجوار کی آبادیاں غارت کرتے اور اگر قبائل کاکوئی قائد نکل آتا تو ان کی غارت گریاں دور دور تک بھی پہنچ جاتیں۔ صدیوں تک ان کی حالت ایسی ہی رہی۔ پھر جب چوتھی صدی مسیحی سے ان کے اندر ایسے قائد پیدا ہونے لگے جنہوں نے نظم واطاعت کاراز پالیا تھا۔ تواچانک ان کی طاقت کاایک نیا دور شروع ہوگیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانچویں صدی میں ائیلاAttlla نے جو ہن قبیلہ کا قائد تھا۔ ایک عظیم فاتح کی حیثیت اختیار کرلی اور رومن ائمپائر کی دونوں مشرقی ومغربی مملکتوں کولرزہ براندام کردیا۔ پھر یہی قبائل ہیں جو بالاخر اس طرح تمام یورپ پر چھاگئے کہ نہ صرف رومن ائمپائر کوبلکہ رومی تمدن کوہمیشہ کیلئے پامال کردیا۔

چند صدیوں کے بعد تاریخ یہ منظر پھر دہراتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود منگولیا میں ایک نیا منگول قائد چنگیز خان پیدا ہوگیا ہے۔ وہ تمام تاتاری قبائل کواپنے ماتحت ایک قوم بنادیتا ہے۔ اور پھر فتح و تسخیر کاایک ایسا ہولناک سیلاب امنڈتا ہے جسے اسلامی ممالک کی کوئی متمدن قوت بھی نہ روک سکی۔ وسط ایشیا سے لے کر عراق تک جوملک اس کے سامنے آیا۔ خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج سے مقصود یہی منگولین قوم اور اس کی تمام صحرا نورد اور وحشی شاخیں ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کے خروج و ظہور کے مختلف دور تاریخی ترتیب سے منضبط کرلیں۔ اسی ضمن میں یہ واضح ہو جائیگا۔ کہ سائرس کے زمانے میں یہ قوم کہاں تھی۔ اور کیوں اسے سد تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

اس بارے میں تاریخ کی شہادتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ پہلا دور تاریخی عہد سے پہلے کا ہے۔ جب شمال مشرق سے ان قبائل کے ابتدائی گروہ نکلے اور وسط ایشیا میں آباد ہوگئے۔ پھر جنوب اور مغرب میں پھیلنے لگے۔ اس خروج و انشعاب کی رفتار بہت سست رہی ہوگی۔ اور بے شمار منزلیں پیش آئی ہوں گی۔

۲۔ دوسرا دور صبح تاریخ کا ہے لیکن روشنی ابھی دھندلی ہے۔ اب اقامت گزینی اور صحرا نوردی کی دو مختلف اور متوازی معیشتوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ شمالی ہند، ایران اور اناتولیا کے قبائل اقامت گزینی کی زندگی میں بدل چکے ہیں۔ مگر وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود تک صحرا نورد قبائل کے جتھے پھیلتے جاتے ہیں۔ اور مشرق سے نئے نئے قبیلوں کے اقدام کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ زمانہ تقریباً ۳۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۵۰۰ قبل مسیح تک کا تصور کرنا چاہیے[1]

---

[1] یہ سن تعیین اس طرح کے تمام تعینات کی طرح محض تاریخی قیاسات پر مبنی ہے اور اسی لئے اس بارے میں نظار تاریخ کی رائیں مختلف ہوئیں۔ البتہ حال کے انکشافات سے ایک بات تقریباً پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ یعنی ڈھائی ہزار سال قبل مسیح اناتولیا میں "حتی" یا "ختی" تمدن شروع ہو چکا تھا۔ اور قدیم مصری تمدن کا معاصر تھا۔ "بوغاز کوئی" میں جو ختی کتب خانہ برآمد ہوا ہے۔ اور جس میں بیس ہزار کے قریب منقوش تختیاں نکلی ہیں۔ اس نے انیسویں صدی کے تاریخی تخمینے بہت کچھ بدل دئے ہیں اور اب یہ رجحان کہ اس زمانے کی مدت گھٹائی جائے تقریباً مفقود ہو رہا ہے۔

۳۔تیسرا دور تاریخ کی روشنی میں پوری طرح نمایاں ہے۔ یہ تقریبا ایک ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو جاتا ہے۔اب بحر خزرا اور بحر اسود کا علاقہ ایک وحشی اور خونخوار قوم کا مرکز بن چکا ہے۔ اور وہ مختف ناموں میں اور مختلف جہتوں سے نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ پھر اچانک تاریخ کے افق پر سیتھین قوم کا نام ابھرتا ہے۔ یہ وسط ایشیا سے لے کر بحر اسود کے شمالی کناروں تک آباد ہے۔ اور اطراف وجوانب میں برابر حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ یہ زمانہ آشوری تمدن کے ظہور اور بابل اور نینوا کے عروج کا تھا۔ اور ہیروڈوٹس کی زبانی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آشورین کی شمالی سرحد پر سیتھین قبائل کی غارت گریاں برابر جاری رہیں۔ یہ شمالی سرحد بحر خزر کے جنوبی ساحل اور ارمینیا کے سلسلہ کوہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور وہ کاکیشیا کے درے سے اتر کر آشوری آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ پھر ۶۳۰ قبل مسیح میں اچانک ان کا ایک عظیم گروہ اسی راہ سے اترتا ہے اور ایران کا تمام مغربی حصہ پامال کر دیتا ہے۔ یونانی مورخ کہتے ہیں کہ آشوری مملکت کی تباہی کا ایک بڑا باعث یہی غارت گری تھی۔[1]

۴۔چوتھا دور ۵۵۰ قبل مسیح کا قرار دینا چاہیے جب سائرس کا ظہور ہوا اور فارس اور میڈیا کی متحدہ شہنشاہی کی بنیاد پڑی۔ اس عہد میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین حملوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور صدیوں تک ان کے حملوں کی کوئی صدا تاریخ کی سماعت تک نہیں پہنچتی۔ اس عہد میں صرف دو موقعوں پر ان کا ذکر آتا ہے۔ پہلا سائرس کے زمانہ میں' جب وہ فتح بابل سے پہلے ''سیتھین'' قبائل کے سرحدی حملوں کا تدارک کرتا ہے۔ دوسرا دارا کے زمانے میں جب وہ باسفورس عبور کر کے دریائے ڈینوب کی

[1] ہیروڈوٹس ۱۰۴:۱

وادیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اور ان قبائل کو دور تک بھگا دیتا ہے۔
دارا کے حملہ کے بعد ان کا دباؤ شمال یورپ کی طرف بڑھنے لگا۔

۵۔پانچواں دور تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اس عہد میں منگولین قبائل کا ایک نیا سیلاب اٹھتا ہے۔ اور پہلے چین کی آبادیوں پر ٹوٹتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وسط ایشیا کی قدیم شاہراہ اختیار کرتا ہے۔ چین کی تاریخ میں انہیں ہیونگ نہ Hiung-Nu کے نام سے پکارا گیا ہے۔ اور یہی نام آگے چل کر ''ہن'' ہو گیا ہے۔

یہی زمانہ ہے جب شہنشاہ چین شین ہوانگ ٹی نے ان حملوں کے روکنے کیلئے وہ عظیم الشان دیوار تعمیر کی جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے۔ اور پندرہ سو میل تک چلی گئی ہے۔ اس کی تعمیر ۲۱۴ قبل مسیح میں شروع ہوئی۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ دس برس میں ختم ہوئی۔ اس نے شمال اور مغرب کی طرف سے منگولین قبائل کے حملوں کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ اس لئے ان کا رخ پھر وسط ایشیا کی طرف مڑ گیا۔

۶۔چھٹا دور تیسری صدی مسیحی کا ہے۔ جب ان قبائل نے یورپ میں ایک نئی کروٹ لی۔ اور بالا آخر رومی مملکت اور رومی تمدن کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا۔

۷۔ساتواں اور آخری دور بارھویں صدی مسیحی اور چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ جب منگولیا میں تازہ دم قبائل کی ایک بڑی تعداد پھر تیار ہو گئی۔ اور چنگیز خاں نے انہیں متحد کر کے ایک نئی فتح مند طاقت پیدا کر دی۔

مندرجہ صدر خلاصہ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں مغربی ایشیا کا تمام علاقہ سیتھین قبائل کے حملوں سے غارت

ہورہا تھا۔ اور جس ہاتھ نے اچانک ظاہر ہوکر ان کے حملے روک دئے اور پھر ہمیشہ کیلئے مغربی ایشیا یک قلم محفوظ ہو گیا،وہ سائرس کا ہاتھ تھ۔ پس یقیناً منگولین نسل کے یہی قبائل تھے۔ جو یاجوج ماجوج کے نام سے پکارے جاتے تھے۔اورذوالقرنین یعنی سائرس نے ان ہی کی راہ کو روکنے کیلئے سد تعمیر کی۔ جس طرح تین صدیوں کے بعد چینی مجبور ہوئے۔ کہ انہیں روکنے کیلئے ایک دیوار تعمیر کریں۔

اب غور کرو سیتھین قبائل کے یہ حملے کس جانب سے ہوتے تھے؟ ہروڈوٹس وغیرہ یونانی مورخ بتلاتے ہیں۔ کہ صرف ایک راہ سے یعنی کاکیشیا کے درہ سے۔ یہی مقام صدیوں تک دونوں علاقوں میں درمیان کا پھاٹک رہاہے۔

اب اگر سائرس ان حملوں سے محفوظ ہوناچاہتاتھا۔ تو کیا اس کے لئے ضروری نہ تھاکہ یہ پھاٹک بند کردے؟ قدرتی طور پر ضروری تھا۔اوراس لئے اس نے سد تعمیر کر کے یہ راہ مسدود کردی۔ چونکہ ان حملوں کی صرف یہی ایک راہ تھی اور وہ اس طرح بند کردی گئی۔ اسلئے یاجوجی حملوں کا بھی یک قلم خاتمہ ہوگیا۔

اب پھر حزقینل نبی کی پیشین گوئی پرایک نظرڈالو۔ اس میں جوج کوروش' مسک اور توبال کا سردار کہاہے۔ اور یہ ٹھیک ان ہی قبائل کے نام ہیں۔ "روش" وہی ہے جس نے "رشیا" نکلا "مسک" وہی جو "موسکوو" ہوا۔ اور توبال "بحراسود کابالائی علاقہ تھا۔

پھر کہاہے کہ "میں تجھے پھرادوں گا۔ اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا"۔

یہ وہی واقعہ ہے۔ کہ سائرس نے سیتھین قبائل کے منہ پھرادیئے اور سد تعمیر کرکے ان پر ان کی راہ روک دی۔ پھر کہاہے ,,ایسا معاملہ واقع

ہو گا کہ ان کے تمام ہتھیار جلا دئے جائیں گے،، اور رہگزاروں کی ایک وادی میں جو سمندر کے پورب میں ہے ان قوموں کا گورستان بنے گا۔ نیز عرصہ تک لوگ لاشیں گاڑتے رہیں گے تاکہ راہ صاف کریں،،۔ یہ وہ واقعہ ہے جو دارا کے حملہ یورپ میں پیش آیا۔ دارا کی فوج مملکت کی تمام اقوام سے مرکب تھی۔ اس میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ باسفورس عبور کر کے مشرقی یورپ پہنچ گیا تھا۔ اور اگرچہ یونانیوں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے واپس ہونا پڑا۔ لیکن اس لشکر کشی میں بے شمار سیتھین مارے گئے اور ان کی قوت عرصہ تک کیلئے مضمحل ہوگئی۔ باقی رہی وہ پیشین گوئی جو مکاشفات میں ملتی ہے۔ تو مکاشفات کے اکثر مقامات کی طرف اس مقام کی بھی کوئی جمتی ہوئی تفسیر شارحین انجیل نہ کر سکے۔ اس میں ایک ہزار برس کی مدت بتلائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت سے مقصود کون سی مدت ہے۔ اور کب سے شروع ہوتی ہے۔ ؟اگر حضرت مسیح سے شروع ہوتی ہو' تو ظاہر ہے کہ دسویں صدی مسیح میں کوئی ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہزار برس سے مقصود وہ مدت ہو جو سقوط بابل سے شروع ہوتی ہے' کیونکہ اس معاملہ سے پہلے بابل کی تباہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر کوئی بات بن سکتی ہے۔ بابل کا سقوط چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ہے۔ اور چوتھی صدی مسیح میں یورپ کے منگولین قبائل نے رومی مملکت پر حملے شروع کر دئے ہیں۔ پس یاجوج ماجوج کا یہ خروج سقوط بابل کے ہزار برس بعد ضرور ہوا ہے۔

ماجوج کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بھی آیا ہے۔ جہاں حضرت نوح کے تین لڑکوں سام' حام اور یافث سے اقوام عالم کا پیدا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یافث کی نسبت لکھا ہے کہ اس سے جمر' ماجوج' مادی'

یونان، توبال، مسک اور تیراس پیدا ہوئے۔ (۱۰:۳)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماجوج سے مقصود منگولین نسل ہے کیونکہ قدیم مورخوں نے اسی تصریح کی بنا پر انہیں یافثی نسل قرار دیا ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ صحیح ہے کہ کتاب پیدائش کا مواد قید بابل کے زمانہ میں تیار ہوا ہے۔ تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ماجوج اور مادیوں کو ہم نسل سمجھا جاتا تھا۔

یہ یاد رہے کہ اگرچہ دنیا عرصہ تک کتاب پیدائش کے اس بیان پر مطمئن رہی۔ اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ تمام قومیں حضرت نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن اب اس کی علمی قدر و قیمت یک قلم مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور اسے کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھتا۔ جس نظر سے ایک تاریخی بیان کو دیکھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک ایسا نوشتہ ہے جس میں ہمیں ۵۰۰ سال قبل مسیح کے یہودی تصورات نظر آ جاتے ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایک عنصر ان مقدس روایتوں کا بھی ہے جو قومی حافظہ نے محفوظ رکھی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی بابلی اور آشوری روایتوں کا بھی ایک عنصر شامل ہو گیا ہے۔ جو قیام بابل کی طویل مدت کا قدرتی نتیجہ تھا۔

سد یاجوج:

اب ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ سائرس نے جو سد تعمیر کی تھی۔ اسکا صحیح محل کیا تھا۔ اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اسے کہاں ڈھونڈنا چاہیے؟ بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے۔ یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے۔ جہاں کاکیشیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا ہے اور بحر خزر سے مل جاتا ہے۔ اس مقام پر قدیم زمانے سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے۔ جو

سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی جاتی ہے۔ اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کا کیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اسطرح اس دیوار نے ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بلند کر دیا تھا۔ دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا۔ جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے قابل عبور ہو سکتا تھا۔

ساحل کی طرف یہ دیوار دہری ہے۔ یعنی اگر آذر بائیجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں۔ تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے ۔ جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے اس میں پہلے ایک دروازہ تھا۔ دروازے سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا۔ اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔

دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے لیکن یہ دوہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے۔ اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے۔

دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں وہاں ایک قلعہ ہے۔ قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا۔ لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے اور اسی پانچ سو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دہری دیوار کو ایرانی قدیم سے ''دوبارہ'' کہتے آئے ہیں یعنی دوہرا سلسلہ۔

یہ قطعی ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے' ساسانی عہد میں یہ مقام موجود تھا۔ اور اسے ''دربند'' کہا جاتا تھا یعنی ''بند دروازہ'' کیونکہ مقدسی، ہمدانی' مسعودی' اصطخروی ' یاقوت اور قزوینی وغیرہ تمام مسلمان مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے اسی نام سے اسکا ذکر کیا ہے۔ اور سب لکھتے ہیں کہ ساسانی عہد میں یہ مقام شمالی سرحد کا سب سے زیادہ اہم مقام تھا۔ کیونکہ اسی راہ سے شمال کے حملہ آور ایران کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ یہ ایرانی مملکت کی

کنجی تھی۔ جس کے ہاتھ یہ کنجی آجاتی، وہ پوری مملکت کا مالک ہوجاتا۔ اسی لئے ضروری ہوا کہ اس کی حفاظت کا اس درجہ اہتمام کیا جائے۔

مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں جب یہ علاقہ فتح کیا تو ساسانیوں کی طرح انہوں نے بھی اس مقام کی اہمیت محسوس کی۔ وہ اسے باب الابواب[1] اور الباب کے نام سے پکارنے لگے۔ کیونکہ مملکت کیلئے یہی مقام شمالی دروازہ تھا۔ اور یہ ان بہت سے دروازوں میں سے آخری دروازہ تھا جو اس دیوار کے طول میں بنائے گئے تھے۔ بعضوں نے اسے "باب الترک" اور "باب الخزر" کے نام سے بھی پکارا ہے۔ کیونکہ "تاتاریوں اور تاتاری انسل کا کیشین قبیلوں کی آمدورفت کی راہ یہی تھی۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور مقام ملتا ہے۔ جو درہ داریاں **Parial Pass** کے نام سے مشہور ہے۔ اور موجودہ زمانے کے نقشے میں اس کا محل ولاڈی کیوکز[2] **Vladi Kaukhz** اور تفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں ہو کر گزرا ہے اور دور تک دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے۔ اور ارمنی روایتوں میں اسے آہنی دروازہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ دیوار کس نے تعمیر کی تھی؟ تمام

[1] عرب جغرافیہ نویس دربندہی کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ عام نام باب الابواب پڑ گیا تھا۔ اس لئے عنوان میں نے اکثروں نے باب الابواب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ یاقوت نے معجم البلدان میں اس مقام کا حال "باب الابواب" ہی کے نام سے لکھا ہے۔ پس حرف "با" میں دیکھنا چاہیے۔ نہ کہ ذال میں۔

[2] یونانی کاکیشیا، روسی کیوکز اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے۔

عرب مورخوں کا بیان ہے کہ نوشیرواں نے تعمیر کی تھی۔ چنانچہ مسعودی نے اس کی تعمیر کی بعض تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔اور بعد کے تمام مصنف اسے نقل کرتے آئے ہیں۔لیکن جب ہم قبل ازاسلام عہد کے تاریخی نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تومعلوم ہوتاہے کہ نوشیرواں کے عہد سے بہت پہلے یہاں ایک دیوار موجود تھی۔اوراس نے شمال سے جنوب کاراستہ روک رکھاتھا۔چنانچہ سب سے پہلے صدی مسیحی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس اسکاذکر کرتاہے۔

پھر پروکوپیئس **Procopius** چھٹی صدی مسیحی کے اوائل میں خود اپنا عینی مشاہدہ نقل کرتاہے۔کیونکہ ۵۲۸ مسیحی میں جب رومن جنرل بلی ساریوس **Belisarius** نے اس علاقہ پر حملہ کیا تو اس کے ہمراہ تھا۔ نوشیرواں کازمانہ ۵۳۱ مسیحی سے ۵۷۹ مسیحی تک تھ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ استحکامات اس کے بنائے ہوئے نہیں ہوسکتے۔

سکندر کاانتساب:

اب یہاں ایک اور الجھاؤ پڑتاہے۔ جوزیفس اور پروکوپیئس دونوں یہ روایت نقل کرتے ہیں۔ کہ ان استحکامات کابانی سکندر تھا حالانکہ سکندر کی فتوحات کاکوئی واقعہ تاریخ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اور کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتاکہ وہ اس علاقہ میں آیاہو یایہاں کوئی جنگ کی ہو۔زمانہ حال کے ایک امریکن مورخ مسٹر اے دی ولیمس جیکسن (پروفیسر کولمبیا یورنیورسٹی) نے اس علاقہ کی سیاحت کی ہے۔ اور اس کے تفصیلی حالات اپنے سفرنامہ[1] میں بیان کئے ہیں۔

---

[1] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب "فروم کونسٹنٹی نوپل ٹو دی ہوم آف عمرخیام"
From Constenti nopal to the home of Umar Khyam
ہم ان کی ایک دوسری تصنیف کا ندوشت کے حالات میں حوالہ دے چکے ہیں۔

وہ اس مشکل کا یہ حل تجویز کرتے ہیں کہ سکندر کے کسی جنرل نے یہ استحکامات تعمیر کئے ہوں گے۔ کم ازکم درہ داریال کے استحکامات بعد کو ساسانی فرمانرداؤں نے انہیں اور زیادہ وسیع اور مکمل کردیا۔ چونکہ ابتدائی تعمیر سکندر کے عہد کی تھی اسلئے سکندر کی طرف منسوب ہوگئی[1]

لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلم بند کردئے ہیں۔ اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر اشارہ نہیں ملتا۔ تو پھر کیونکہ ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیحات قابل اطمینان تسلیم کرلی جائیں۔؟

اس طرح کے غیر معمولی استحکامات جبھی تعمیر کئے جاسکتے ہیں جبکہ امن وحفاظت نے انہیں ناگزیر کردیا ہو۔ لیکن سکندر کو اپنی تمام فتوحات میں اس طرح کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے زمانہ میں یہ علاقہ ایران کے قدیم شہنشائی کے ماتحت تھا۔ اس نے شام کی راہ سے ایران پر حملہ کیا۔ اور پھر وسط ایشیا ہوتا ہوا ہندوستان چلا گیا۔ ہندوستان سے واپسی پر ابھی بابل ہی میں تھا کہ انتقال کرگیا۔

ایسی حالت میں وہ کون سے حالات ہوسکتے ہیں جو کاکیشیا کے استحکامات پر اسے مجبور کرسکتے تھے؟ اور اگر پیش آئے تو کب؟

اصل یہ ہے کہ استحکامات سکندر سے دوسو برس پہلے سائرس نے

---

[1] بہت ممکن ہے کہ سکندر کی نسبت یہ خیال اس بناء پر پیدا ہوگیا ہو کہ بعد کے بعض مورخوں نے غلطی سے اس سلسلہ کوہ کو کاکیس لکھ دیا ہے۔ جو بحر خزر کے مشرق جانب واقع ہے۔ اور جسے سکندر نے وسط ایشیا سے ہندوستان جاتے ہوئے طے کیا تھا۔ اسٹرابو نے اس غلطی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تعمیر کئے تھے۔ اور درۂ داریال کی سد وہی سد ہے۔ جسکا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل وجوہ و قرائن سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے:

اولاً: سائرس اور سکندر کی دو باتیں تاریخ کی قطعی روشنی میں آچکی ہیں۔ سائرس کے زمانے میں یہاں سے سیتھین قوم کے حملے ہورہے تھے۔ سکندر کے زمانے میں کوئی حملہ آور نہیں تھا۔ سائرس کیلئے ضروری تھا کہ یہ راہ روکے۔ سکندر کو کوئی ایسی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سائرس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے۔ کہ فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کی۔ سکندر کی نسبت کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ ان دو باتوں کے جمع کرنے سے جو تاریخی قرینہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ سد سائرس نے تعمیر کی ہوگی۔ نہ کہ سکندر کے حکم سے اس کے کسی افسر نے۔

ثانیاً: پروکوپس کے علاوہ دوسرے قدیم مورخوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ٹی ٹس **Tacitus** اور لیڈس **lydus** نے۔ وہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ رومی اسے کاپین پورٹا کے نام سے پکارتے تھے۔ یعنی ''باب کا سپین'' لیکن اس طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ کہ یہ سکندر کے عہد کی تعمیر ہے۔

ثالثاً: ایک مثبت شہادت بھی موجود ہے۔ جو سائرس کی طرف ذہن منتقل کردیتی ہے۔ یہ ارمنی نوشتوں کی شہادت ہے۔ جسے قرب محل کی وجہ سے مقامی شہادت تصور کرنا چاہیے۔

ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام ''بھک کورائی'' اور ''کاپان کورائی'' چلا آتا ہے۔ دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ ''کور کا درہ''!

سوال یہ ہے۔ کہ ''کور'' سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ ''گورش'' کی بدلی

ہوئی شکل تو نہیں۔ جو سائرس کا اصلی نام تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبہ اصطخر میں پڑھا جاچکا ہے۔

پروفیسر جیکسن اس ارمنی نام کا ذکر کرتے ہیں ۔ لیکن وہ ''گور'' کا تلفظ ''سور'' کرتے ہیں اور پھر عربی کے نام ''سول'' کا اسے ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس طرح لفظ کی حقیقت گم
ہو جاتی ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے ۔ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی۔ وہ درہ داریال کی سد ہے یا دربند کی دیوار ؟یا دونوں؟ قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا۔ اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا۔ اس نے درمیان کا حصہ پاٹ کے برابر کردیا۔ اس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا۔ تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں۔

یہ پتھر کی بڑی سلوں کی دیوار ہے۔ اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے۔ اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درہ داریال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے۔ یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے۔ اور جو سد تعمیر کی گئی ہے۔ اس نے درمیان کی راہ بالکل مسدود کردی ہے۔ چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی

---

[1] دربند نامہ ص ۲۱ دربند کی تاریخ میں یہ ایک نہایت جامع کتاب ہے۔ جو ۱۸۴۵ء میں ایک ترک مصنف کاظم بک نے لکھی ہے۔ یہ سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں ترکی وفارسی کا پروفیسر تھا۔ اور خود دربند کا بادشاہ تھا۔ ۱۸۵۱ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہسٹری آف دربند کے نام سے شائع ہوا۔

سلوں سے کام لیا گیا تھا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں ''آہنی دروازہ'' کانام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے۔اسی کا ترجمہ ترکی میں ''دامر کپو''[1] مشہور ہو گیا۔

بہر حال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی سد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد خود اس نے یا اس کے جانشینوں نے یہ دیکھ کر کہ کاکیشیا کا مشرقی ڈھلوان بھی خطرے سے خالی نہیں۔دربند کی دیوار تعمیر کردی ہو۔اور نوشیرواں نے اسے اور مضبوط کیا ہو۔یا ممکن ہے کہ فی الحقیقت نوشیرواں ہی کی تعمیر ہو۔

دیوار دربند کی موجودہ حالت:

دربند کی دہری دیوار ۱۷۹۶ء تک موجود تھی۔ جس کی تصویر ایک روسی سیاح کی بنائی ہوئی ایچ والڈ **Eichwald** اپنی کتاب ''کواکیسیس'' میں نقل کی ہے۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں جب پروفیسر جیکسن نے اس کا معائنہ کیا تو گو آثار باقی تھے لیکن دیوار گر چکی تھی۔البتہ اکہری دیوار اکثر حصوں میں اب تک باقی ہے۔

موجودہ زمانہ کے شارحین تورات میں بھی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے کہ یاجوج ماجوج سے سیتھین قوم مراد تھی۔ لیکن وہ حزقئیل کی پیشین گوئی کا محمل ان کا وہ حملہ قرار دیتے ہیں جو ہیروڈوٹس کے قول کے مطابق ۶۳۰ قبل مسیح میں ہوا تھا۔ لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیدا ہو جاتی ہے کہ حزقئیل کی کتاب بابل کی اسیری کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی بخت نصر کے اسیروں میں سے تھے۔ اور سیتھین حملہ اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس باب میں مزید تفصیلات کیلئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور جیولش

---

[1] ترجمہ دربند نامہ کاظم بک صفحہ ۲۱ پروفیسر جیکسن نے بھی اس نام کا ذکر کیا ہے۔ اور اسے قدیم ایام کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ (فروم کونسٹنٹی نوپل ٹو ہوم آف عمر خیام صفحہ ۶۱)

انسائیکلوپیڈیا میں لفظ GoG کا مقلہ دیکھنا چاہیے۔
ہم نے ذوالقرنین کے مبحث میں پوری تفصیل سے کام لیاہے۔ کیونکہ زمانہ حال کے معترضین قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزا کانشانہ بنایاہے۔ وہ کہتے ہیں ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔ یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی۔ جو پیغمبر اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی۔ اور نقل کردی۔ اسلئے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کردیاجائے کہ شک وتردد کا کوئی پہلا باقی نہ رہے۔

استدراک

ا۔ہم نے سائرس کے جس مجسمہ کااوپر ذکر کیاہے۔ اور جس سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوگئی ہے۔ کہ ''ذوالقرنین'' اسی کالقب تھا۔ وہ قدیم سنگ تراشی کی صناعیوں کاایک نہایت نادر نمونہ ہے۔ اور موجودہ عہد کے تمام اہل نظر کافیصلہ ہے کہ یونانی سنگ تراشی کے نمونوں کی صف میں اگر کوئی ایشیائی نمونہ رکھا جاسکتاہے تو وہ یہی سائرس کامرمری مجسمہ ہے۔ یہ ایران کے قدیم دارالحکومت استخر سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دارا نے شاہی محل تعمیر کیاتھا۔ اب اس کا بقیہ صرف چند مرمری ستون رہ گئے ہیں ان ہی میں سے ایک مربع ستون پر یہ مجسمہ ابھارا گیاتھا۔

سب سے پہلے ۱۸۳۵ء میں جمیس موریر نے اس کی موجودگی سے علمی دنیا کو روشناس کیا۔ پھر چند سال بعد سر رابرٹ کیر ریوپورٹر نے اس مقام کی عملی پیمائش و تحقیق کرکے مفصل معلومات بہم پہنچائیں۔ اور اپنے سفرنامے جارجیا وایران میں مجسمہ کی وہ نقل بھی شائع کردی۔ جو اس نے پنسل سے تیار کی تھی۔ اس وقت تک قدیم پہلوی زبان اور میخی خطوط کامسئلہ پوری طرح حل نہیں ہواتھا۔ تاہم یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مجسمہ سائرس ہی کاہے۔ بعد کی

تحقیقات نے مزید تصدیق کردی پھر ۱۸۸۴ء میں دی لافو نے اپنی مشہور کتاب میں اس کا لرٹ انٹی کیوانیرس میں اس کا اصلی عکس شائع کردیا۔ اوراس طرح مجسمہ کی اصلی نوعیت دنیا کے سامنے آگئی۔اس وقت سے لے کر یہ مجسمہ تارخ قدیم کے مباحث کاایک عام موضوع رہاہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی یورپین مستشرق کاذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ اس کی نوعیت میں قرآن کے ''ذوالقرنین'' کی صریح اور قطعی تصدیق نمایاں ہوگی۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ تغافل مذہبی تعصب کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان میں کافی تعداد ایسے اہل علم کی ہے جویقیناآن تعصّبات کی آلودگیوں سے اپنی حفاظت کرسکتے ہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ تغافل عمل ونظر کے عجائب مستثنیات میں سے ہے۔

۲۔اس مجسمہ میں سائرس کے سرپر دوسینگ نکلے ہوئے ہیں۔اور اطراف میں عقاب کے سر پر سینگوں کامطلب واضح ہوچکا۔ لیکن عقاب کے سر پرکیوں بنائے گئے۔ اسکا جواب بھی ہمیں یسعیاہ نبی کے صحیفہ سے مل جاتاہے۔ اس میں جہاں سائرس کے ظہور کی خبردی گئی ہے۔ وہاں یہ بھی ہے کہ:۔''دیکھو میں ایک عقاب کویورپ سے بلاتاہوں۔اس شخص کو جو ایک دور کے ملک سے آکرمیری ساری مرضی پوری کرے گا۔ (باب ۴۶:۱۱)

اس سے معلوم ہواکہ جسطرح عقاب کی تشبیہ یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آچکی ہے خواہ یہ پیشین گوئیاں بعد کو بنائی گئی ہوں۔ خواہ فی الحقیقت پیشتر کی ہوں۔ لیکن یہ ظاہر ہوگیاکہ سائرس کیلئے دوسینگوں کااور عقاب کا تخیل پیدا ہوچکا تھا۔ اور ٹھیک یہی تخیل ہے جواس مجسمہ میں متشکل ہوگیاہے۔

❀❀❀❀

دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹنے کا بہترین نسخہ

درود پاک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ اس کے دس گناہ معاف اور دس درجے بلند فرمائے گا۔ (سنن نسائی)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا طرزِ تحریر اردو زبان کا ایک معجزہ ہے

امام الہند ابوالکلام آزادؒ کے معجز نگار قلم کے وہ علمی و ادبی شاہپارے جنھیں ''طارق اکیڈمی'' نے حسنِ طباعت سے آراستہ کیا

1. ← انسانیت موت کے دروازے پر
2. ← ولادتِ نبویﷺ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ
3. ← حقیقتِ صیام
4. ← اسلام کا نظریہ جہاد
5. ← حقیقتِ حج
6. ← قولِ فیصل
7. ← حقیقتِ زکوٰۃ
8. ← مسلمان عورت
9. ← اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان
10. ← امر بالمعروف و نہی عن المنکر

- کمپیوٹر کتابت
- عربی، فارسی اشعار اور عبارتوں کا ترجمہ
- آیات و احادیث کے حوالہ جات
- رنگین ٹائٹل، اعلیٰ کاغذ، مجلد